نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

فضل من ذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

عرفان و آگہی کے کئی راز ہیں اُٹھائے

کئی چھٹ گئے اندھیرے لو اُجالے لوٹ آئے

لو اُجالے لوٹ آئے

خاکپائے پیر فہمیؒ خواجہ شیخ مُحمّد فاروق شاہ قادری الچشتی اِفتخاری

معروفؔ پیر عفی عنہ

تاج العارفین حضرت خواجہ شیخ محمد عبدالرؤف شاہ قادری الچشتی افتخاری

پیر فہمی مدظلہ العالی

TAJ-UL-AARFIN HAZRAT KHWAJA SHAIKH MOHAMMED ABDUL RAUF SHAH QADRI

AL CHISHTI IFTEKHARI **PEER FEHMI** MADZALLAHUL AALI

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

افضل الذکر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

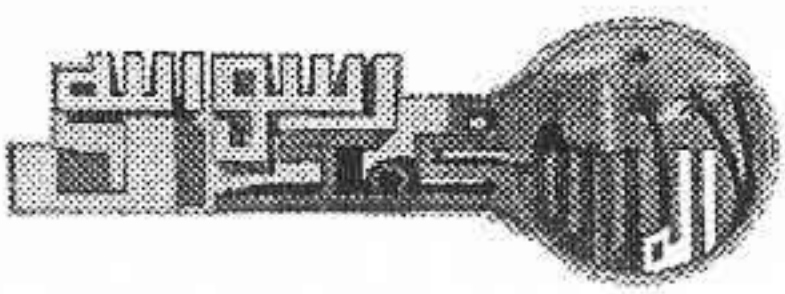

عرفان و آگہی کے کئی راز ہیں اُٹھائے
کئی چھٹ گئے اندھیرے لو اُجالے لوٹ آئے

لو اُجالے لوٹ آئے

خاکپائے پیر فہمی خواجہ شیخ مُحمّد فاروق شاہ قادری الچشتی اِفتخاری

معروف پیر عفی عنہ

منجملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

ارکان

کتاب کا نام : لو اُجالے لوٹ آئے

مصنف : خواجہ شیخ محمد فاروق شاہ قادری الچشتی افتخاری معروف پیر

نوعیتِ اشاعت : باراول

تعدادِ اشاعت : ۵۰۰ (پانچ سو)

مقامِ اشاعت : بموقع جشن غوث الوریٰؒ و جشن خواجہ غریب نوازؒ و جشن پیر عادل بیجاپوریؒ آستانہ حضرت فہمی پیر، حال خورد، تعلقہ خالہ پور، ضلع رائے گڑھ۔

تاریخِ اشاعت : ۲۳ر نومبر ۲۰۰۸ء بمطابق ۲۴ر ذی القعدہ ۱۴۲۹ھ

طباعت : ڈیسینٹ کریئشنس .700 80 641 - 022 / 800 3039 977

قیمتِ کتاب : ۴۰ / روپئے

کتاب ملنے کے پتے

حضرت پیر فہمی، خانقاہِ قادری الچشتی عادل فہمی نوازی، عادل نگر، آکاش وانی گیٹ نمبر ۷ مالونی کالونی، ملاڈ (مغرب)، ممبئی ۹۵

افسر شاہ قادری، بھگت سنگھ نگر نمبر ۱، لنک روڈ، گوریگاؤں (ویسٹ) ممبئی۔ ۱۰۴

عبداللہ شاہ قادری، غریب نواز نگر، کوکری آگار، ایس۔ ایم روڈ، انٹاپ ہل ممبئی۔ ۳۷

شیخ شاہین شاہ قادری، ہاؤس نمبر 9-8-109/A/76، گول کنڈہ، صالح نگر، کنچہ، حیدرآباد

محمد مولا علی شاہ قادری، B2/10/2، سیکٹر نمبر 15، واشی، نئی ممبئی 703

ناصر قادری، محمدی لونڈری، حوابی کی چال، عیدگاہ میدان، جوگیشوری (ایسٹ) ممبئی۔ ۶۰

انتساب

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

لاکھوں احسان و شکر اُس ربِ کائنات کا، کروڑوں درود و سلام آقائے نامدار مدنی تاجدار سرکارِ دو جہاں محمد مصطفٰے ﷺ پر و صد در صد احسان و شکر پیرانِ پیر روشن ضمیر حضرت غوثِ اعظم دستگیر رضی اللہ عنہ و خواجہء خواجگاں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ و تمامی اولیاء و مشائخین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا جن کی روحانی امداد ہر دم قدم پر شاملِ حال ہے۔

انسان خدا کا مظہر اتم ہے۔اس لئے وہ قابلیت رکھتا ہے کہ صفاتِ بشری کو فنا کر کے خدا میں مل جائے اور خدا کے صفات حاصل کر کے بقا کے مرتبہ کو پہنچے۔رسول و پیغمبر علیہ السلام خدا کے مظہر خاص ہوتے ہیں۔حصولِ معرفت کے لئے انسان کو مختلف ذرائع سے گذرنا پڑتا ہے۔میرے آقا و مولا پیر روشن ضمیر حضرت خواجہ شیخ محمد عبدالروٗف شاہ قادری الچشتی افتخاری پیر فہمیؔ مدظلہ العالی نے انھیں رموز سے آگاہی بخش کر خلافت قادریہ عالیہ خلفائیہ و خلافت چشتیہ بہشتیہ سے سرفراز فرما کر مسند رشد و ہدایت پر فائض کیا۔اسی رشد و ہدایت کے ضمن میں کتابِ ھٰذا لواُجالے لوٹ آئے ہے۔جو میں اپنے پیر و مرشد کی بارگاہِ ولایت میں نذر کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکپائے پیر فہمی خواجہ شیخ محمد فاروق شاہ قادری الچشتی افتخاری

معروف پیر عفی عنہ

جس طرح آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ جتنی گہرائی سے آنکھ دیکھ سکتی ہے اتنی گہرائی سے جسم کا ہر خلیہ احساس کر سکتا ہے۔

سوال: تصوف کو بڑھاپے میں سیکھنا چاہیے؟

جواب: تصوف جینے کا ہنر سکھاتا ہے۔ اور جینے کا ہنر جوانی میں چاہئے بڑھاپے میں سیکھ کر کیا کریں گے۔

قول : ہر لفظ دوئی سے پیدا ہوتا ہے۔

نکتہ : شعور کی دو قسمیں ہیں۔ ایک میں ہوں کا شعور دوسرا ہوں کا شعور۔ جب تم پوری طرح سے مٹ جاؤ گے محظ ایک خالی صف ہو جاؤ گے۔ تب بھی شعور باقی رہے گا پر میں فنا ہو جائے گا۔ 'میں' کا احساس ہی آدمی کو ہمیشہ باہر کی اور ڈھکیلتا ہے جیسے ''میں'' جا رہا ہوں۔ ''میں'' کھا رہا ہوں۔

قول : تغیّر کا نام ہی وقت ہے۔ بدلاہٹ کی تیزی ہی وقت کی رفتار ہے۔

قول : حق ایک ہے پر جاننے والوں نے اسے الگ الگ ڈھنگ سے جانا ہے۔

راز: راز کیا ہے؟ نام اور انام کے بیچ میں ایک ہونا ہے۔ اسی کا نام ہے راز۔ جو کئی ہوتے ہوئے بھی جو ایک بنا رہتا ہے۔ اسے ہی ہم راز کہتے ہیں۔ راز کا مطلب ہوتا ہے جسے ہم جان بھی لیتے ہیں اور پھر بھی نہیں جان پاتے جسے ہم پہچان بھی لیتے ہیں پھر بھی وہ انجانا رہ جائے۔ لاعلمی کے اوپر علم ہے اور علم کے اوپر راز ہے۔ جاہل کو یہ گمان ہے کہ وہ نہیں جانتا اور عالم کو یہ گمان ہے کہ وہ جانتا ہے۔ کسی کا قول ہے کہ جاہل تو اندھیرے میں بھٹکتا ہے پر عالم اس سے بڑے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ جاہل اس لیے بھٹکتا ہے کہ وہ

نہیں جانتا اور عالم اس لیے بھٹکتا ہے کہ میں جانتا ہوں۔ جس کی وجہ سے اس میں سے عاجزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور تکبّر مقام کر جاتا ہے۔ راز جاننے کا نام نہیں بلکہ جاننے کے اوپر اٹھ جانا ہے۔ راز کے معنی ہیں کہ جو اندھیرے میں ہے وہی اجالے میں ہے۔ پیدائش و موت ایک ہے اسی کو جاننے کا نام راز ہے۔ جو راز داں ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ''میں'' کو مٹاؤ کیونکہ جب تک میں ہوگا تب تک راز کو جاننے کا شوق وذوق میں اتنا جوش نہ ہوگا۔ ''میں'' کے معنی ہیں ''میں'' جانتا ہوں مجھے سب پتہ ہے۔ اور جیسے ہی میں کو فنا کرے گا فوراً راز کو جاننے کا جوش بڑھ جائے گا۔ ایک ہے علم سے پہلے کا راز۔ ایک ہے علم کے بعد کا راز۔ ایک آنکھ والا راز ایک نابینا راز ہے۔

قول :سونے اور جاگنے میں صرف پلک کے کھلنے اور بند ہونے کا فرق ہے۔

کثافت اور لطافت میں فرق :

جو شئے ہمیں حواس کے ذریعے یا حواس سے بنائے گئے آلہ جات کے ذریعے ہمیں معلوم ہو یا جسے ہم محسوس کر سکیں اسے کثافت کہیں گے۔ اور جو بغیر حواس خمسہ کے ذریعے معلوم ہوا سے ہم لطافت کہیں گے۔

''جس آدمی میں رازوں کی سمجھ آجاتی ہے وہ لطافت کا دروازہ کھول لیتا ہے۔''

اگر میں بغیر کان کے آپ کو سن سکوں یا بغیر آنکھ کے آپ کو دیکھ سکوں تو یہ لطافت ہے۔

کرامت :کرامت وہ فعل جس کی وجہ سمجھ میں نہ آسکے کیونکہ ہر فعل کی

کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ جیسے ایک آدمی بیمار ہو اور ڈاکٹر سے دوا لے اور ٹھیک ہو جائے ہم اس کو کرامت نہیں کہیں گے کیونکہ یہاں ٹھیک ہونے کی صاف وجہ معلوم ہو رہی ہے۔ مگر کوئی آدمی کسی بزرگ کے قدموں پر سر رکھے اور ٹھیک ہو جائے تو اسے ہم کرامت کہیں گے۔ کیونکہ یہاں اس کے ٹھیک ہونے کی وجہ معلوم نہیں ہو رہی ہے۔ مگر اس میں بھی وجہ ہے۔ ایک تو ایسی ہے جیسے بجلی آپ کے جسم میں داخل ہو کر آپ کو جھٹکا دیتی ہے یا جسمانی نظام کو کچھ دیر کے لیے سن کر دیتی ہے ٹھیک اسی طرح نیک آدمی کی جسمانی بجلی انسانی بیماری کو ٹھیک کر دیتی ہے جسے آج ریکی کہتے ہیں۔ حقیقی کرامت وہ ہے جہاں فاعل اور وجہ ایک ہو جائیں۔ جہاں دو کی گنجائش نہ ہو۔

قول: جو خواہش سے بھرا ہے وہ ہی کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔

قول: نفسانیت سے بھرا ہوا من جہاں ہے وہاں کبھی نہیں ہوتا اور جہاں نہیں ہے وہاں سدا ڈولتا رہتا ہے۔

قول: نفسانیت سے بھرا ہوا من راز سے واقف نہیں ہو پاتا صرف باہر ہی بھٹکتا رہتا ہے۔ کبھی اندر داخل نہیں ہو پاتا۔

قول: نفس ہمیشہ بدلاؤ پر جیتا ہے۔

قول: سب سے بڑی خواہش کوئی خواہش نہ ہونا۔

قول: انسان چھوٹی خواہش کو بڑی خواہش سے (Replace) بدل دیتا ہے۔ یعنی چھوٹی خواہش کو اسی وقت چھوڑتا ہے جب اس کے سامنے کوئی بڑی خواہش ہو۔

نکتہ: انسان جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے یعنی اسی خواہشات کا جوڑ۔

اگر انسان کی تمام خواہشات جھڑ جائیں تو انسان کیا ہوگا۔ صرف ایک صفر ایک خلاء مگر اسی صفر سے زندگی کا دروازہ کھلتا ہے۔ آپ ایک مکان بناتے ہیں۔ اس میں ایک درواز بناتے ہیں۔ کبھی خیال کر کے دیکھو کہ دروازہ کیا ہے۔ دروازہ ایک صفر ہے۔ دروازے کا مطلب ہے جہاں سے داخل ہو جانا ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی دیوار سے داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں کچھ ہے۔ صفر ہی کاملیت کا دروازہ ہے۔

قول : جس شخص کو بدصورتی کا پتہ نہیں ہوتا اسے خوبصورتی کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔

قول : ہم اسی بات پر زور دیتے ہیں جہاں مقابل پہلے سے ہی پیدا ہو چکا ہے۔

نکتہ : دوئی کے ختم ہوتے ہی ایک بھی خود بخود ختم ہو جاتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ دوئی کے مٹ جانے کے بعد ایک باقی رہ جائے گا مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ دوئی کی ہی وجہ سے ایک دکھائی پڑ رہا تھا اگر ہمیں ایک کو بتانا ہے تو ہمیں ایک کے سامنے دو تین چار لکھنا ہوگا ورنہ ایک کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا کوئی اسے لکیر کوئی کچھ سمجھے گا۔ پہاڑ میں اونچائی اور نیچائی دونوں ہیں مگر جب ہم پہاڑ کی اونچائی کو ختم کر دیں گے تو خود بخود نیچائی ختم ہو جائے گی کیونکہ اونچائی ہی نے نیچائی کو پیدا کیا تھا۔

مقامِ وصل میں سوچو تو اللہ ہے نہ بندہ ہے
فقط ایک نام کی ہے قید قطرہ ہے نہ دریا ہے

بندے کے مٹتے ہی خدا بھی مٹ جاتا ہے جب تک بندہ تھا تب تک

اللہ تھا۔ جیسے قطرہ دریا میں مٹ جاتا ہے۔ قطرہ قطرہ نہیں رہ جاتا بلکہ دریا ہو جاتا ہے، اور جیسے ہی دریا قطرہ سے وصل کرتا ہے تو دریا دریا نہیں رہ جاتا بلکہ قطرہ ہو جاتا ہے۔ جہاں قطرہ مٹا وہاں دریا خود بخود مٹ جاتا ہے پھر سوال اٹھتا ہے وصل کیوں؟ تو ایک یہ معنی ہے کہ ایک قطرہ میں دریا کی کمی تھی دوسرا معنی ہے کہ دریا میں بھی ایک قطرہ کی کمی تھی اور جیسے دونوں ملے پھر وہی نہیں رہ گئے جس طرح قطرہ مٹ گیا اسی طرح دریا بھی مٹ گیا دونوں کے مٹ جانے کا نام ہی وصل ہے۔ قطرے قطرے سے دریا بنا ہے۔ اگر ہم یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ قطرہ چھوٹا دریا ہے اور دریا بڑا قطرہ ہے۔

نکتہ : بیماری جسم کا حفاظتی خول ہے۔ بیماری تندرستی کا ہی حصّہ ہے۔ نظام زندگی کا انحصار ضد پر ہے۔ ہر چیز اپنے مخالف سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ ہر چیز اپنے مخالف چیز کا خیال دیتی ہے۔ زندگی موت کا خیال دیتی ہے۔ وجود عدم کا۔ اسی طرح عدم بھی وجود کا خیال دیتا ہے۔ جس طرح زندگی موت کا خیال دیتی ہے تو موت بھی زندگی کا خیال دیتی ہے۔ زندگی ہے تو موت ہے۔ زندگی ہی موت کا دروازہ ہے۔ جب بات سمجھ میں آجائے تو انسان نہ زندگی سے بھاگے گا نہ موت سے گھبرائے گا۔ انسان دو میں سے ایک کو چنتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ تندرست رہے اور بیماری نہ رہے۔ جوانی رہے پر بڑھاپا نہ رہے۔ اچھائی رہے پر بُرائی نہ رہے۔ جب انسان ایک کو چنتا ہے جس کی وجہ سے تناؤ آجاتا ہے۔ ایک کو پکڑنے اور ایک کو چھوڑنے کے چکر میں کھینچاؤ آجاتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ جیسے رات دن سے جڑا ہوا ہے یا تو انسان دونوں کو قبول کرلے یا دونوں کو چھوڑ دے تو پُر

سکون رہ سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہماری عزّت کریں پر جیسے ہی ہم یہ سوچتے ہیں فوراً بے عزّتی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بے عزّتی آتی اسی وجہ سے ہے کہ ہم عزّت چاہتے ہیں۔ جو عزّت کے لئے تیار ہے وہ بے عزّتی کے لئے بھی تیار ہو جائیں۔ چاہے کوئی ان دونوں کو پکڑیں یا نہ پکڑیں پر دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ ساتھ ساتھ بھی نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو۔ سرے ہیں۔ مثلاً جیسے اندر کی سانس اور باہر کی سانس۔ کوئی سانس اندر لیں اور باہر نہ چھوڑیں یا باہر چھوڑیں اور اندر نہ لیں تو مر جائے گا۔ باہر چھوڑی جانے والی سانس بھی وہی ہے جو اندر لی گئی تھی بظاہر دو نظر آنے والی سانس ایک ہی ہے بلکہ جوڑا ہے دونوں ایک دوسرے کو مدد کرتے ہیں۔ جس سے وجود کی حیات قائم رہتی ہے۔

نکتہ : جوان کے پاس طاقت ہوتی ہے پر مکمل تجربہ نہیں ہوتا۔ اور بوڑھوں کے پاس مکمل تجربہ ہوتا ہے پر طاقت نہیں ہوتی۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ جوان کو طاقت کی ضرورت ہے جس سے وہ اور تجربہ حاصل کرے اور بوڑھا مرنے والا ہے اور مر کر قبرستان جانے والا ہے قبرستان جانے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

نکتہ : ہم اعلیٰ شخصیت اسے مانتے ہیں جس نے دین و دنیا میں بہت کچھ کیا ہو۔ ہمارا پیمانہ یہ ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔ ''وہ کیا ہے'' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتا۔ ہمارا اعلیٰ ماننے کا پیمانہ ہی غلط ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی اعلیٰ بن بیٹھتا ہے جس کا ہونا کوئی اثر پیدا نہ کرے تو اس کا بیان کیا اثر پیدا کرے گا۔ مقناطیس جہاں ہوتا ہے ایک قوّت کشش کا دائرہ نظام خود بخود

وجود میں آجاتا ہے جولوہے کے ذرّات اس دائرے کے اندر ہوتے ہیں خود بخود کھنچے چلے آتے ہیں۔ اگر مقناطیس کوخود جانا پڑے تو سمجھ لو کہ وہ مقناطیس ہی نقلی ہوگا۔ کوئی فعل فاعل سے بڑا نہیں ہوتا۔ جس بزرگ کو دیکھ کر چور چوری نہ چھوڑے تو اس بزرگ کے بیان سے کیا خاک چوری چھوڑ سکتا ہے۔ کوئی بزرگ کسی فعل کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے۔ مگر متکبّر شخص ہر فعل کو اپنی ''انا'' سے جوڑ دیتا ہے۔ حتی کہ وہ فعل بھی جو نہیں کرتا ہے۔ مثلاً میں سانس لیتا ہوں۔ میں بیمار ہوں۔ میں جوان ہوں۔ میں بوڑھا ہوں۔ یہ تمام باتیں جہالت کے اندھیرے میں رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر جو حقیقت کے علم سے آراستہ ہوتا ہے اسے خبر ہو جاتی ہے کہ فاعل حقیقی کون ہے؟ اگر کسی بزرگ سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جائے جو خرق عادات میں شامل ہو تب بھی وہ بزرگ یہی کہیں گے کہ کرامت کی نہیں جاتی بلکہ کرامت ہو جاتی ہے۔

قول : زندگی ایک لمبے فعل جاریہ کا نام ہے۔ جہاں کوئی نہ کوئی فعل ظہور میں رہتا ہے ۔غصّہ کرنا۔ پیار کرنا۔ سانس لینا۔ جاگنا۔ سونا وغیرہ۔

قول : ہر کھوج وہی دوبارہ کھوج ہے۔ ایسی کوئی کھوج نہ تھی جو جانی نہ گئی ہو۔ پر جنھوں نے بھی جانا تھا وہ اتنے بلندی پر تھے کہ وہ کھوج اس وقت لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکی اور کہیں کھو گئی جس کی وجہ سے دوبارہ کھوج کرنا پڑا۔

قول: ہر پریشانی کی وجہ مالکیت کا دعویٰ ہے۔

نکتہ : اس کائنات میں جو کچھ بھی جانا جا سکتا ہے وہ انسان کے لاشعور میں موجود ہے صرف ہم بے خبر ہیں۔ مثلاً لاکھوں برس کے بعد بیج میں سے لاکھوں پھل نکلیں گے وہ بھی آج کے درخت کے پھل کے بیج میں موجود

ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں جس کو ہم نہیں جانتے تھے اور اب جان گئے بلکہ ہمارے باطن میں وہ موجود ہی تھا بس فرق اتنا ہے کہ اب شعور میں روشنی آئی جس کی وجہ سے ہم اس بات سے باخبر ہو گئے۔

نکتہ :جب آدمی عورت کو چاہتا ہے تو اس کی بیوی خوش ہو جاتی ہے کہ میرا شوہر مجھ سے محبت کرتا ہے پر آدمی ذات عورت سے پیار کرتا ہے جو کہ اس کی فطرت ہوتی ہے۔ آج اگر اس عورت سے پیار کر رہا ہے جو کہ اس کی بیوی ہے کل کو کسی اور عورت سے بھی پیار کر سکتا ہے جو کہ ذات آدمی کا تقاضا ہے۔ پر بیوی یہ چاہتی ہے کہ آدمی مجھ سے ہی پیار کرے اور کسی دوسری عورت سے پیار نہ کرے۔ جب آدمی میں سے عورت کو پیار کرنے کی قابلیت ختم ہو جاتی ہے تو پھر آدمی اپنی بیوی سے بھی پیار نہیں کر سکتا۔

نکتہ :سکون اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب ہمارا تکبّر پوری طرح سے ختم ہو جائے۔ بے سکونی کے معنی ہیں ٹکراؤ تکبّر کبر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''بڑے'' کے۔ ہمیں خود کو بڑا بنانے کے لئے دوسروں کو چھوٹا بنانا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ ٹکراؤ رہتا ہے۔ اور سکون کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ ہم ہمیشہ لڑ رہے ہیں۔ باہر کاروباری لڑائی، گھر میں گھریلو لڑائی۔ ہم ہمیشہ لڑائی ہی میں ہیں بس مورچہ بدل جاتا ہے۔

* **قول** :آدمی اسی چیز کا دکھاوا کرتا ہے جس سے پوری طرح سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔

قول : اپنے بچاؤ کے لئے ہر کوئی لڑ رہا ہے مگر وہی جیت پاتا ہے جو سب میں بہتر ہو۔

نکتہ: مکان دیواروں کا نام نہیں بلکہ اس کے اندر کی خالی جگہ کا نام ہے۔ جیسے مٹکا باہر سے لگتا ہے جیسے مٹی سے بھرا ہو مگر اندر سے وہ کھوکھلا و خالی ہوتا ہے۔ حقیقت میں مٹکا خالی جگہ کا ہی نام ہے۔ ہمارا جسم بھی مکان کی طرح ہے اور اس کے اندر کی خالی جگہ وہی ''ہم'' ہیں۔

قول: جانکاری ہی جاننے سے روک دیتی ہے۔ کیونکہ ہر جانکاری ادھوری اور ادھار ہوتی ہے۔

قول: ہم اللہ کے بارے میں جانتے ہیں پر اللہ کو نہیں جانتے۔

نکتہ: جس خیال کی ہم مخالفت کرتے ہیں اس خیال کو جگہ مل جاتی ہے۔ پھر وہی خیال ہمیں ستانے لگتا ہے اس لئے ہم کسی بھی چاہے اچھے ہو یا برے خیال کی نانفی کریں نا اثبات۔ جو خیال آرہا ہے اسے آنے دیں۔ جو خیال جارہا ہے اسے جانے دیں۔

نکتہ: خالی جگہ کو بھرا جاسکتا ہے پر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے ایک مکان خالی ہو اور ہم سامان سے بھر دیں تو اس کا مطلب خالی جگہ ختم نہیں ہوگئی بلکہ چھپ گئی خالی جگہ کوئی چیز نہیں ہے جسے ختم کیا جاسکے۔ بلکہ خالی کا معنی ہے کچھ نہیں۔ جو نہیں ہے اسے کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ پھر جیسے ہی ہم سامان ہٹائیں گے وہ خالی جگہ دوبارہ ظاہر ہو جائے گی یہ نہیں کہ وہ کہیں باہر سے آئے گی۔

قول: جو آدمی افواہ سن کر لوٹ جائے اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

اشارہ: مراقبہ عقل کی اوپری سطح کو توڑنے کے لئے کیا جاتا ہے اوپری سطح جیسے ہی ٹوٹتی ہے تو اندر داخلہ ہو جاتا ہے پھر اندر کی آنکھ سے ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔

نکتہ: انسان دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلا حصّہ سمجھ کا ہے۔ دوسرا حصّہ کرتا پن کا ہے۔ مگر الجھن یہ ہے کہ جو حصّہ سمجھ کا ہے جو سمجھ لیتا ہے مگر اس کے پاس کوئی کام کرنے کی طاقت نہیں ہوتی جس کے پاس کام کرنے کی طاقت ہوتی ہے اس کے پاس قوّت سمجھ نہیں ہوتی۔ اگر ہم نا سمجھ بنتے ہیں تو اس حصّے میں داخلہ ہو جاتا ہے جہاں سمجھ کا گزر نہیں آہستہ آہستہ کر کے دونوں حصّوں میں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے پھر ایک دن وہ آتا ہے کہ دونوں حصّے ایک ہو جاتے ہیں۔ جہاں انسان مکمل و کامل ہو جاتا ہے۔

قول: غصہ پاگل پن ہے پر وقتی طور پر۔

راز: انسان اپنے اصل چہرے کو پہچانے کہ اصل چہرہ کون سا ہے۔ وہ جو ماں کے پیٹ میں بنایا وہ جو بچپن میں تھا یا وہ جو جوانی میں تھا یا وہ جو بڑھاپے میں تھا ماں کے پیٹ سے لے کر آخری سانس تک کروڑوں مرتبہ چہرہ بدل جاتا ہے پھر کیسے معلوم کریں کہ ہمارا اصل چہرہ کون سا ہے۔

جواب: اصل ہمارا وہ چہرہ ہے جب ہمارا وجود بھی نہ تھا۔ خدا کی بھی اصل صورت کیا ہے یہ بھی اسی وقت معلوم ہو گی جب تم اپنی اصل صورت تلاش کر لو گے۔

نکتہ: ابھی تک انسان نے کسی بھی چیز کو نہیں دیکھا بلکہ ہر چیز کا عکس دیکھا ہے۔ ہم عکس دیکھ کر گمان میں پڑ جاتے ہیں کہ ہم نے اس چیز کو دیکھا حالانکہ حقیقت اس سے الگ ہے جب ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس چیز کا عکس ہمارے آنکھ پر گرتا ہے پھر اس عکس کو دماغ دیکھتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اس چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ مثلاً کسی آدمی کو اگر پیلیا ہو جائے تو اس آدمی کو ہر

چیز پیلی نظر آئے گی جبکہ اس چیز کا رنگ کچھ اور ہی کیوں نہ ہو ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سو آدمی میں سے ہر دوسرے آدمی کی دیکھنے کی قوّتِ رنگ میں فرق ہے۔ کسی کو ایک خاص رنگ نظر نہیں آتا۔ اسی طرح ہماری آواز کا عکس کان پر پڑتا ہے اسی طرح ہمارے احساس کا عکس جلد پر پڑتا ہے۔

اشارہ: خدا کو ماننے والے کہتے ہیں کہ خدا ہے اور خدا کو نا ماننے والے کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یا تو خدا ہے یا نہیں ہے فیصلہ ہو گیا۔ مگر ان دونوں باتوں کے علاوہ بھی سچ کچھ اور ہو سکتا ہے۔ ایک خدا ہے۔ دوسرا خدا نہیں ہے۔ تیسرا خدا ہے بھی اور نہیں بھی چوتھا کچھ اور جس کے بارے میں کہا نہیں جا سکتا۔ مثلاً کوئی کہے کہ مٹکا وہاں پر ہے پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ مٹکا نہیں بلکہ مٹی ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے وہ نہ تو مٹکا ہے نہ تو وہ مٹی ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ مٹکا بھی ہے اور وہ مٹی بھی ہے۔ یا کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ دونوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

قول: ہر سانس پر ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔

اشارہ: جو سانس اندر آ رہی ہے وہ باہر جانے کے طرف اشارہ ہے اور جو سانس باہر جا رہی ہے وہ پھر اندر آنے کے لئے ہمت جٹاتا ہے کیوں کہ جو سانس باہر کی طرف جا رہی ہے اس سے پھیپھڑے خالی ہو جاتے ہیں جونہی پھیپھڑے خالی ہو جاتے ہیں تو ان میں پھر سے بھرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

* **علم نفسیات**: انسان کے اندر جو چل رہا ہے اس کا جسمانی حرکات سے پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کوئی عورت کسی آدمی کو پسند نہ کرتی ہو تو

اس آدمی سے بات کرتے وقت اسکی کمر تھوڑی پیچھے کی اور جھکی ہوگی۔ اگر کوئی آدمی دکان پر کپڑا لے رہا ہو تو دوکان دار آدمی کی آنکھ کی طرف دیکھتا ہے کہ اس کی آنکھ کس کپڑے پر زیادہ دیر تک رکتی ہے اور بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ تین سیکنڈ سے زیادہ کسی کی اور دیکھنا گویا اس کی زندگی میں مداخلت کرنا ہے۔

علم نفسیات :انسان لفظوں سے اس طرح بندھ گیا ہے کہ خود اپنے سے بات کرنے کے لئے بھی لفظوں کا سہارا لیتا ہے جبکہ الفاظ دوسروں تک اپنی بات و پہنچانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایک آدمی جو روزانہ سلام کرتا ہو اور جواب دیتا ہو مگر ایک دن سلام کرنا یا سلام کا جواب نہ دے تو لوگوں کا اس آدمی کو دیکھنے کا جو نظریہ تھا وہ پورا بدل جاتا ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ اس کو بہت گھمنڈ آگیا ہے۔ تھوڑا مال کیا آگیا صاحب کا تیور بدل گیا۔ صرف ایک لفظ کے لئے ہم اس آدمی کو پوری سوانح عمری بدل دیتے ہیں ۔ یہ ہے لفظوں کا اثر ہر کوئی جتنا ہو لفظوں کو زیادہ سے زیادہ دماغ میں جمع کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ۔ تانکہ لوگوں پر میری بات کا زیادہ سے زیادہ رعوب جم سکے۔

قول :اس دنیا میں انسان سے زیادہ کم عقل کوئی نہیں ہے۔ ایک معنی میں۔

عورت کا راز

عورت کا راز اندھیروں کا راز ہے۔ جو عورت کا راز سمجھا وہ خدا کا بھی راز سمجھ سکتا ہے۔ مرد کے ''نہیں'' کے معنی ''نہیں'' کے ہوتے ہیں۔ مگر عورت کے ''نہیں'' کے معنی ''نہیں'' کے بھی ہوتے ہیں اور ''ہاں'' کے بھی ہوتے ہیں

۔ایک ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقت ایک عورت کو بچہ پیدا کرنے میں لگتی ہے۔ ایک مرد کا باپ بننا رسمی ہے گویا اس نے کسی فعل کا آغاز کر دیا مگر اس فعل کو انجام تک پہنچانا صرف عورت کا کام ہے۔اسی لئے عورت کا ماں بننا رسمی نہیں بلکہ فعل حق ہے۔ آج سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ وہ مرد کے اسپرم (SPERM) کو ہزاروں سال تک سنبھال سکتا ہے۔ایک آدمی مرنے کے دس ہزار سال کے بعد بھی باپ بن سکتا ہے پر ماں بننے کے لئے عورت کا زندہ ہونا ضروری ہے۔ آدمیوں نے ہزاروں ایجادات کیے پر عورت کی صرف ایک ایجاد ہے وہ ہے کسی کو زندہ پیدا کرنا۔قدرتی نظام کے اعتبار سے اگر سو لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو ایک سو سولہ لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہوتے 116 لڑکوں میں سے صرف 100 لڑکے زندہ رہ جاتے ہیں اور 16 لڑکے مر جاتے ہیں۔اسی طرح تعداد برابر ہو جاتی ہے۔عورت مرد کے مقابلے میں کچھ برس زیادہ زندہ رہ سکتی ہے۔

اور مرد کے مقابلے میں کم بیمار ہوتی ہے۔عورت بغیر کچھ کیے سب کچھ کر سکتی ہے پر آدمی کو کچھ کرنے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے۔عورت بغیر کہے وہ کہہ سکتی ہے جو آدمی لفظوں کا ذخیرہ رکھ کر بھی نہیں کہہ سکتا۔عورت میں ہر چیز قبول کرنے کا قدرتی مادّہ ہوتا ہے۔اور آدمی میں حملہ کرنے کا مادّہ ہوتا ہے۔ خدا کو پانے کا راز بھی عورت کے راز میں ضم ہے۔خدا کو کوئی حملہ کر کے جیت نہیں سکتا بلکہ عورت کی طرح زیر ہو کر اپنے دل کا اگر دروازہ کھول دے تو خدا خود بخود اس کے دل میں داخل ہو جاتا ہے۔

پُر خاموش انتظار ایک عورت کر سکتی ہے مرد نہیں۔عورت کو جب بھی

عزّت کی نظر سے دیکھا گیا تو اس لیے کہ وہ ماں ہے عورت ماں کے مقام کی وجہ سے جتنی عزّت پائی اتنی عزّت وہ کسی کی بیوی بن کر نہ پا سکی۔ آج بھی سماج عورت کو اگر کسی خاص ایوارڈ سے نوازتا ہے تو وہ ہے ماں۔ جیسے مدر ٹریسا، ام المومنین وغیرہ۔ جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اس کے سیکس ہارمون (Sex Harmon) بعد میں بننا شروع ہوتے ہیں۔ مگر جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کے تمام انڈے وہ ساتھ لے کر پیدا ہوتی ہے۔ یعنی لڑکی مکمل پیدا ہوتی ہے اور لڑکا بعد میں مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے لڑکی میں ایک طرح کا سکون ہوتا ہے اور لڑکے میں ایک طرح کی بے چینی ہوتی ہے۔ لڑکے کو پر سکون بنانے کے لئے طریقے ڈھونڈے جاتے ہیں اور لڑکی کو بے چین کرنے کے لئے ذریعہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس کی بہت گہری وجہ ہے کہ لڑکی جس سیکس کروم سے پیدا ہوتی ہے اس کے خلیہ (CELL) XX ہوتے ہیں۔ یعنی دونوں ایک ہوتے ہیں اور لڑکا جس سیکس کروم (Sex Chrome) سے پیدا ہوتا ہے اس کا ایک خلیہ (CELL) X اور اس کا دوسرا خلیہ (CELL) ''Y'' ہوتا ہے۔ وہ دونوں برابر نہیں ہوتے۔ عورت میں توازن (BALANCE) ہوتا ہے۔ یعنی ایک X ہے تو دوسرا بھی X ہے۔ مگر آدمی میں توازن (Balance) نہیں ہوتا۔ کیوں کہ دونوں خلیے متضاد جدا ہوتے ہیں۔ عورت کی خوبصورتی کا راز بھی اسی ''XX'' میں ہے۔ اس کی ایک جیسی رفتار سے خوبصورتی بڑھتی ہے مگر مرد کی رفتار ایک جیسی نہیں ہوتی اس لئے مرد کی ویسی خوبصورتی ترقی نہیں پاتی جیسا کہ عورت کی خوبصورتی میں بات ہے۔ عورت کے وجود کو

بنانے والے 48 ایٹم ہیں وہ پورے ہیں ۔ 24+24 کر کے اور آدمی کو بنانے والے 47 ہیں ۔بس یہ ایک کی کمی آدمی کو زندگی بھر دوڑاتی ہے ۔اس دکان سے اس دکان ۔زمین سے چاند تک جو ایک کم ہے وہ پورا ہونا چاہتا ہے ۔عورت کے اسی توازن کے وجہ سے ان میں ہر چیز کی قبولیت کا مادّہ مرد کے مقابلے میں زیادہ بہت زیادہ ہوتا ہے ۔عورت کا ماں بننا اس کا پھیلاؤ ہے اور باپ کے لئے محظ باعث فکر۔

اندھیرے کا راز

اندھیرے کے معنی ہیں جس کو دیکھا نہ جا سکے ۔اندھیرے میں جو بھی چیز ہوگی وہ اندھیرے کے پردے میں چھپی ہوگی نور کو لایا جا سکتا ہے ۔نور کو فنا ہے پر اندھیرے کو فنا نہیں ۔ کیوں کہ اندھیرا تب سے ہے جب سے نور کا نام و نشان نہ تھا ۔روشنی کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جا سکتے ہیں پر اندھیرے کو کوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ پر نہیں لے جا سکتے ۔کوئی چراغ کو پھونک کر بجھا سکتا ہے مگر ساری دنیا کی طاقت بھی مل کر اندھیرے کو نہیں بجھا سکتی ۔اندھیرے کے ایک معنی خالی کے بھی ہے گویا اندھیرا اپنے میں مکمل خالی ہوتا ہے اس لئے اندھیرے کے باوجود بھی کمرے میں سامان رکھا جا سکتا ہے ۔اندھیرے سے وحدت کا ظہور ہوا اور اجالے سے کثرت کا ۔اندھیرے میں ہی ہر بیج نشو ونما پاتی ہے ۔رحم مادر کے اندھیرے میں ہی بچہ پرورش پاتا ہے ۔ اندھیرے کے ایک معنی نہیں کے بھی ہیں ۔سائنسدانوں کے پاس چاند سورج ستارے و دیگر سیاروں سے زمین کا درمیانی فاصلہ ناپنے کا جو پیمانہ مقرر کیا ہے وہ روشنی کی رفتار ہے ۔جیسے سورج کی روشنی زمین پر 8 منٹ 20 سیکنڈ میں آتی

ہے۔فی سیکنڈ 3 لاکھ کلومیٹر کا پیمانہ مقرر کیا گیا ہے۔اسی اعتبار سے ہر ستاروں کی درمیانی پیمائش کی جاتی ہے۔مگر جس کا احاطہ اور جس کی پیمائش نہیں کی جاسکتی اس کو سائنس داں اپنی زبان میں کچھ نہیں (NOTHINGNESS) کہتے ہیں۔یہاں نہیں سے مراد نہیں نہیں ہے بلکہ اس کی پیمائش حساب سے باہر ہے۔اندھیرے کو کبھی معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی پیمائش کیا ہے اس لئے اندھیرا ابھی نہیں کے دائرے میں شامل ہے۔

نکتہ :حسد،کینہ،بغض،غصہ،فریب تمام تر عادت خبیثہ ہمارے میں غفلت کی وجہ سے داخل ہو پاتے ہیں۔ہماری بے ہوشی کا مرکز اور سبب ہمارا میں پنا و انانیت ہے جب ہم کسی مقدس مقام پر جاتے ہیں تو ہمارا قلب ایک عجیب قسم کا سکون محسوس کرتا ہے۔پھر جب ہم وہاں سے چلے آتے ہیں تو وہ سکون غائب ہو جاتا ہے جیسے کہ تھا ہی نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی دیر تک ہم اس مقدس مقام پر تھے اتنی دیر تک ہمارا وجود ''میں پناں'' سے خالی تھا اسی لئے ہمارے وجود میں سکونیت تھی۔ہمارا ''میں پن'' وجود میں فساد برپا کرتا ہے۔ کبھی سوچا ہے جب ہم سو جاتے ہیں اور پھر اٹھتے ہیں تو ایک طرح کی تازگی محسوس کرتے ہیں جو سارے دن میں کام آتی ہے۔اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ جب ہم سو جاتے ہیں تو میں پن بھی سو جاتا ہے پھر صبح قوّت مل جاتی ہے۔ ہمارا تکبّر ہر وقت بدلتا رہتا ہے مگر اتنی تیزی سے یہ بدلاؤ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس کے بدلاؤ کی خبر نہیں ہو پاتی۔بچہ ماں کے پیٹ میں 24 گھنٹے سوتا رہتا ہے۔قدرت کاملہ بچہ کو 24 گھنٹے سولائے رکھتی ہے تا کہ اس کو اپنے ''میں'' کی خبر نہ ہو جائے ورنہ وجود کی تعمیر رک سکتی ہے۔پھر بچہ دنیا کے آب و

ہوا میں آتا ہے اور بائیس 22 گھنٹے، پھر 20 گھنٹے، ایسے کرتے کرتے وہ جوانی میں 8 گھنٹے اور بڑھاپے میں 4 گھنٹے پر آجاتا ہے۔ جب 4 گھنٹے میں آجاتا ہے تو وجود میں توڑنے کا کام شروع ہوجاتا ہے۔ بالآخر موت واقع ہوجاتی ہے۔ تکبّر بھی قدرتی ہے جس طرح بیماری بھی قدرتی ہے۔ زہر بھی قدرتی ہے مگر ہم زہر بھی پینا چاہتے ہیں اور مرنا بھی نہیں چاہتے جو زہر پیئے گا وہ ضرور مرے گا۔

قول: ہر خواہش انسان کو باہر سے پریشان کرتی ہے مگر امید انسان کو اندر سے پریشان کرتی ہے۔

نکتہ: آیت قرآنی ہے "جان لو اللہ کے ذکر میں دلوں کا سکون ہے"۔ ہر ذاکر کی یہی شکایت ہوتی ہے کہ ہمیں سکون نہیں ملا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ذرا سمجھیں، جب ذاکر ذکر کرتا ہے تو اس کا سارا خیال سکون پر ہوتا ہے کہ اتنی دیر سے ذکر کر رہا ہوں سکون نہیں ملا۔ بلکہ اور بے چین ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ راز جو آیتِ قرآنی میں ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم سکون کے لئے ذکر کرنا چاہتے ہیں، جبکہ راز یہ ہے کہ ذکر میں سکون ہے۔ بات تو ایک جیسی معلوم ہوتی ہے پر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یعنی سکون کو کوئی پیدا نہیں کرسکتا نہ کہیں بازار میں ملتا ہے بلکہ جب ذاکر ذکر میں کھو جاتا ہے تو سکون خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔

اشارہ: غیر معمولی انسان کون ہے؟

ہر آدمی اپنے آپ کو معمولی سمجھنا نہیں چاہتا بلکہ غیر معمولی ہی سمجھتا ہے۔ حقیقت میں غیر معمولی انسان وہ ہے جو اپنے کو معمولی سمجھتا ہے۔ یہی وہ صفت

ہے جو ایک عام آدمی کو خاص کر دیتی ہے۔

اشارہ :بچہ دنیا میں آ کر جو پہلی چیز لیتا ہے وہ سانس ہے۔کوئی بچہ سانس لیتا ہوا پیدا نہیں ہوتا۔آ کر سانس لیتا ہے۔اور کوئی انسان جب دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو جو چیز آخر میں چھوڑتا ہے وہ بھی سانس ہے۔کوئی انسان سانس لیتا ہوا دنیا سے نہیں جاتا۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زندگی ایک دائرے کے مانند ہے جہاں سے شروع وہاں پر ختم بھی ہے۔یاد رہے زندگی میں کچھ بھی سیدھا نہیں۔پر ہم ہر چیز کو سیدھا دیکھنا چاہتے ہیں اسی لئے چوک جاتے ہیں۔زندگی کی رفتار دائرہ نما ہے۔صرف زندگی کی رفتار ہی نہیں بلکہ زمین، چاند، سورج ہر ایک کی رفتار دائرے نما ہے۔

اشارہ :جس چیز کو بھی ہم بار بار محسوس کرتے ہیں وہ چیز مر جاتی ہے۔اگر مجھ کو کسی سے بھی پیار ہے تو میں دن میں چار دفعہ پتہ لگا لینا چاہتا ہوں کہ پیار ہے یا نہیں، پوچھ لینا چاہتا ہوں، ذریعہ تلاش کرتا ہوں، جس کے ذریعہ کہلایا جا سکے کہ ہاں پیار ہے۔چاہنے والے ہی چاہت کا قتل کر دیتے ہیں یہ بات محض پیار پر ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر بھی یہ بات لازم آتی ہے۔اگر کسی کو یہ بات بار بار یاد آتی ہو کہ میں افضل ہوں تو وہ شخص خود اپنے ہاتھوں سے اپنی افضلیت کو مٹا دیتا ہے۔آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم بار بار محسوس کرتے ہیں وہ مٹ جاتی ہے تو اس کی وجہ ہے۔پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم اسی چیز کو بار بار محسوس کرنا چاہتے ہیں۔جس پر ہمارا بھروسہ نہیں ہوتا۔اندرونی طور پر جو ہمیں بھروسہ نہیں ہے اسی بھروسے کی جانچ کرنے کے لئے ہم بار بار ایسا کرتے ہیں۔اکثر ذاکرین و مراقب اور مراقبہ سے تعلق رکھنے

والوں کی یہ شکایت ہے کہ جیسے ہمیں پہلے مزہ آتا تھا اب ہمیں ویسا مزہ نہیں ملتا ۔ کیوں کہ ذاکر و شاغل اسی مزے کو دوبارہ پانے کے لئے وہی عمل بار بار کرتے ہیں جس کا پہلی دفعہ تجربہ حاصل کیا تھا۔ بار بار وہی عمل دوہرانے کی وجہ سے وہ عمل باسا ہو گیا۔ اور باسا ہونے کی وجہ سے اس عمل کو محسوس کرنے کا جو مادّہ تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک ہی قسم کا عطر روزانہ لگاتے ہیں تو بھلا ساری دنیا کو اس کی خبر لگ جائے پر ہم کو اس کی خبر نہیں ہوگی ۔ ہمارے ناک کے نتھنے اس خوشبو کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اگر کسی خوبصورت رنگ کو بھی بار بار دیکھتے رہیں تو آپ کی آنکھ کا تعلق بار بار دیکھنے کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ پھر خوبصورت رنگ بھی بے رنگ نظر آتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کے دیکھنے کی قوّت ختم ہوگئی بلکہ جو چیز ہمیں مل جاتی ہے ہم اسے بھلا دیتے ہیں۔ پھر ہمارے حواس بھی اس کو محسوس نہیں کر پاتے آدمی بھی عجیب ہے جو لطف اس کو ملتا ہے اس کو بار بار پانے کے لئے کھوجتا ہے۔ پھر جو لطف ملا تھا وہ بھی کھو جاتا ہے زندگی میں سارے حادثات الٹے ہوتے ہیں جو آدمی پائے ہوئے مزے کو دوبارہ پانے کی کوشش نہیں کرتا اس کو وہ مزہ روز روز مل جاتا ہے۔ ہمارے زندگی میں اتنا غم کیوں ہے۔ کیوں کہ ہم غم کو پانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے ۔ اس لئے جو غم کا مزہ ہے وہ قائم رہتا ہے اور ہم خوشی کو بار بار پانے کے لئے کوشش کرتے ہیں ۔ اور وہ نہیں ملتی انسان جس کو چھوتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ جس کے پیچھے بھاگتا ہے ملتا نہیں ۔ جو مانگتا ہے وہ کھو جاتا ہے اسی لئے زندگی کوئی کتاب حساب نہیں بلکہ گہرا راز ہے جو اس راز کو سمجھ لیتا ہے وہی اس کو جی پاتا ہے۔

اشارہ/ جس چیز کو بھی ہم میرا کہتے ہیں اسی وقت ہم اس چیز کے غلام بن جاتے ہیں/ یعنی مالکیت قائم کرتے ہی غلام ہوجاتے ہیں جتنی بڑی مالکیت ہوگی اتنی بڑی غلامی ہوگی ۔ اسی لئے کئی بزرگوں نے بادشاہت کو ترک کردیا۔ انھوں نے حکومت کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی غلامی کو چھوڑا۔ حکومت چھوڑنا آسان ہے بانسبت ایک بھکاری کے بھیک مانگنے کے کٹورے سے۔ ایک بادشاہ حکومت چھوڑ سکتا ہے مگر ایک بھکاری اپنے بھیک مانگنے کے کٹورے کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کٹورے کی غلامی اتنی چھوٹی ہے جس کو بھکاری دیکھ نہیں سکتا۔ اپنے علاوہ کسی پر مالکیت کا دعویٰ کرنا غلامی ہے۔

اشارہ :جب کوئی عمل کامیاب ہوجائے تو خود کو اوجھل کرلو اس سے پہلے کہ دل میں یہ خیال پختہ ہوجائے کہ یہ عمل میں نے کیا ہوں اور تکبّر اسے برباد کردے۔ مگر ہم الٹا کرتے ہیں ۔ جب ہم ناکام ہوتے ہیں تو اوجھل ہو جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو ہماری ناکافی کی خبر نہ لگے۔

قول :تمام خواہشات کا دروازہ جسم ہے۔

نکتہ :ہر پیدا ہونے والا بچہ مقام وحدت میں پیدا ہوتا ہے مگر یہ مقام وحدت اس کے لاشعوری میں ہوتی ہے ۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اسے کسی فرق کا پتہ نہیں ہوتا اس کے جسم اور شعور میں کوئی لکیر فرق نہیں ہوتی جسم اور شعور ایک ہی وجود کی طرح بڑھتے ہیں مگر زندگی کی ضرورتیں، تہذیبیں، سماج، حفاظت جسم اور شعور میں فرق پیدا کرنا شروع کردیتا ہے۔ بچہ کو اگر بھوک لگتی ہے تو بھی ہمیں اسے سکھانا پڑتا ہے کہ جب بھوک لگے اسی وقت کھانا ملے یہ ضروری نہیں بھوک کو روکنا بھی ضروری ہے۔ جب نیند آئے بستر مل جائے یہ

بھی ضروری نہیں ۔ پیاس لگے اور پانی ملے یہ بھی ضروری نہیں ۔ ہر چیز پر قابو رکھنا بھی سکھانا پڑتا ہے ۔ جیسے ہی بچہ میں قابو رکھنے کی قابلیت آجاتی ہے اسی وقت اسے یہ علم ہو جاتا ہے کہ میں الگ ہوں اور جسم الگ ہے کیوں کہ جسم کو بھوک لگتی ہے اور میں بھوک کو روک لیتا ہوں جسم کو نیند آتی ہے اور میں نیند کو روک لیتا ہوں ۔ میں روک سکتا ہوں ۔ جسے میں روک سکتا ہوں اس سے میں الگ ہو جاتا ہوں ۔ جیسے جیسے بچہ میں قابو کرنے کی قابلیت میں ترقی ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے جسم اور شعور میں دراڑ پڑنا شروع ہو جاتی ہے ۔ وہ دراڑ روز بروز بڑی ہوتی چلی جاتی ہے ۔ یہ دراڑ جتنی بڑی ہوتی جاتی ہے ۔ اتنا وجود کے ساتھ ایک ہونا مشکل ہوتا جاتا ہے ۔ جسے اپنے وجود کے ساتھ بھی ایک ہونا مشکل ہو گیا ہو اسے اتنے بڑے رب العالمین کے ساتھ ایک ہونا اور مشکل ہو جاتا ہے ۔ چند تجربات و حالات کے پیش نظر بچہ کی بھلائی کے لئے جو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے تا کہ جب حالات خوش گوار نہ ہوں صبر و ضبط اور قابو کا مادّہ ہونا چاہیے ۔ عمر کے ساتھ ساتھ تقاضوں میں بھی اضافہ ہوگا ۔ ان مانگوں کو پورا کرنے کے لئے وہ کوئی غلط راہ اختیار نہ کر لے اسی لئے ایسی تربیت کی اشد ضرورت ہوتی ہے ۔ جو نسل در نسل چلی آرہی ہے مگر یہی تربیت تمام زندگی کا نظام مرکز بن جاتی ہے دھیرے دھیرے ایسا لگتا ہے کہ جو مانگ کر رہا ہے وہ الگ معلوم ہوتا ہے اور جو روک رہا ہے وہ الگ معلوم ہوتا ہے ۔ خواہش الگ اور عقل الگ معلوم ہونے لگتی ہے ۔ عقل اور خواہش جیسے ہی دو معلوم ہونے لگتے ہیں ہمارے اندر دو حصّے ہو جاتے ہیں پھر ہم پوری زندگی انھیں دو حصّوں کی کشمکش میں پریشان ہوتے رہتے ہیں ۔ خواہش اپنی مانگ کرنے لگتی ہے

اور عقل اس کو قابو کرنے لگتی ہے۔ دھیرے دھیرے پورا وجود آپس میں تقسیم ہونا شروع کر دیتے ہیں۔ ناف کے نیچے کا حصّہ خواہش سے جڑ جاتا ہے اور ناف کے اوپر کا حصّہ عقل سے جڑ جاتا ہے۔ اسی لئے ہم زیر ناف والا حصّہ ہمیشہ چھپائے رکھتے ہیں ہماری پہچان کا نشان ہمارا سر بن جاتا ہے جہاں پر ہماری عقل ہوتی ہے۔ جو انسان اپنے جسم کو کثیف روح اور روح کو لطیف جسم سمجھ پاتا ہے وہی دوئی کو ختم کر پاتا ہے پھر وحدت کا جو احساس ہوتا ہے وہ عین شعوری میں ہوتا ہے۔

نکتہ : جو لوگ زندگی کا مقصد تلاشتے ہیں وہ زندگی کو جی نہیں پاتے ان کی پوری زندگی اسی سوال کے گھیرے میں گزر جاتی ہے کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے پر ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں بلکہ زندگی ہی مقصد ہے۔ اگر کوئی آدمی جواب تلاش کر لاتا ہے کہ زندگی کا مقصد خدا کو پانا ہے تو پھر سوال وہی ہوگا کہ پھر خدا کو پانے کا کیا مقصد۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ کوئی بھی مقصد زندگی سے باہر نہیں ہو سکتا مگر ہماری بے وقوفی ہر وقت کوئی نہ کوئی مقصد ڈھونڈ لیتی ہے کیوں کہ ہم نے سمجھ دار آدمی کی یہ نشانی مان لی ہے کہ سمجھ دار آدمی کوئی بھی کام بغیر مقصد کے نہیں کرتا۔ ذرا کھیلتے ہوئے بچوں سے پوچھوں کے تم کیوں کھیل رہے ہو؟ تو وہ بچے خاموش ہو جائیں گے کیوں کہ بچے کھیلنے کے لئے کھیلتے ہیں۔ ان کا کھیلنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اور ہم کھیل بھی بغیر مقصد کے نہیں کھیل سکتے۔ جب کھیل بھی کسی مقصد کئے لئے کھیلا جاتا ہے تو وہاں ہار اور جیت کے معنے بدل جاتے ہیں جسے بھی جینا ہے وہ آج ہی میں جی سکتا ہے اور مقصد کے معنی ہیں کہ کل میں

جینا۔ کل میں کوئی جیا ہے نہ جی سکتا ہے۔ کل کے معنی ہیں جو ابھی ہے نہیں۔ جو ابھی ہے یہیں ہے موجود ہے اسی میں جیا جا سکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ بھی معنی نہیں کہ کسی آدمی کو کل ٹرین پکڑنا ہے وہ آج ہی ٹرین پکڑ لے۔ یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ کل کی ٹرین کا ٹائم ٹیبل آج ہی بنانا ہوگا مگر ٹائم ٹیبل بناتے وقت اس لمحہ کو بھی جئے کہ میں ٹائم ٹیبل بنا رہا ہوں لیکن ہم کل کی ٹرین کے لئے آج پورا دن پریشان رہتے ہیں۔ اگر ہم ڈوبتے ہوئے کسی آدمی کو بچاتے ہیں تو ابھی اس کے بچانے کی خوشی بھی حاصل نہ ہوئی تھی کہ ہم ہزاروں خیالات دل میں لے آتے ہیں کہ کسی نے ہم کو دیکھا کہ نہیں دیکھا۔ کل کے اخبار میں ہمارے کارنامے کا ذکر ہوگا کہ نہیں۔ تھوڑی سی خوشی بھی کل کے نذر ہو جاتی ہے۔ جسے بھی زندگی کا مزہ پانا ہے وہ جینے میں ہی پا سکتا ہے جس طرح کھانے کا مزہ کھانے میں ہی پایا جا سکتا ہے نا کہ کھیلنے میں اور کھیلنے کا مزہ کھیلنے ہی میں پایا جا سکتا ہے نا کہ کھانے میں۔ جو آدمی جینے کے لئے جئے گا وہی جینے کا سکھ پا سکتا ہے وہی زندگی کی خوشیاں لے سکتا ہے۔ جیسے ہی یہ بات سمجھ میں آجائے کہ زندگی ہی اپنا مقصد ہے یعنی جینا ہی مقصد ہے ویسے ہی سوال کا رُخ بدل جائے گا تب ہم یہ نہیں پوچھیں گے کہ کس لیے جئیں تب ہم پوچھیں گے کہ کیسے جئیں ''کیسے'' روحانیت پیدا ہوتی ہے اسلام پیدا ہوتا ہے تصوف کا ظہور ہوتا ہے سائنس وجود میں آتی ہے تمام انبیاء کرام کا نزول ہوتا ہے۔

نکتہ: خدا کو جو جاننے نکلے ہیں وہ خدا کو جان نہیں سکتے۔ کیوں کہ خدا کو جانا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ جسے ہم جان لیتے ہیں اس کی ایک شکل

بن کر ہماری جانکاری میں قید ہو جاتی ہے۔ خدا ہر قید سے مبّرا ہے۔ خدا جو ہے جسے ہم چھو نہیں پاتے۔ دیکھ نہیں پاتے جس کے ہونے سے انکار نہ کیا جا سکے۔ وہ ایسے موجود ہے جیسے کہیں بھی نہ ہو جو تمام جان لینے کے بعد بھی باقی رہ جائے وہ خدا ہے۔

قول : آدمی اسی سے محبت کر سکتا ہے جس سے نفرت کر سکتا ہے۔

نکتہ : پاگل ہونے کا راز خود سے باہر کی دوڑ ہے۔ جتنا آپ پاگل ہو جائیں گے اتنے ہی دکھی ہو جائیں گے۔ دکھ کی جگہ کا نام ہی جہنم ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہم اس کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ رات کی نیند دن کا چین حرام کر دیتے ہیں۔ کوئی ترقی کر رہا ہے تو ہم دوڑنے لگتے ہیں۔ جو خود سے باہر جوا لگائے گا وہ ہار جائے گا۔ باہر کی کوئی چیز ملتی نہیں پھر پاگل پن ہی رہ جاتا ہے۔

نکتہ : غصّے کے بارے میں ہم ہمیشہ سوچتے ہیں کہ غصہ باہر سے آتا ہے بلکہ غصہ ہمیشہ اندر ہی سے آتا ہے۔ ہمارے اندر کا برتن سدا غصے سے بھرا رہتا ہے۔ مگر بلا وجہ اگر ہم نے غصہ کیا تو لوگ ہمیں پاگل سمجھیں گے اس لئے غصے کو باہر نکالنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اس بات کو ایک تجربے کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک آدمی کو دس دن کے لئے ایک کمرے میں بند کر دو۔ وہ آدمی چار پانچ دن میں ہی کمرے کے اندر کے برتن پر اپنا غصہ نکالنا شروع کر دے گا۔ پھر آخر میں جب اسے کچھ نہ ملے تو خود پر غصہ کرتے ہوئے مل جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ جب باہر آئے تو ایک پاگل اور اس میں کچھ فرق محسوس نہ ہو۔

سوال :جس طرح ہم نے دیگر چیزوں کا مزہ لیا ہے کیا ہم غصّے کا بھی مزہ چکھ سکتے ہیں؟

جواب :غصّے کا بھی مزہ چکھا جا سکتا ہے۔ جب غصّہ پوری طرح سے آجائے تو تھوڑی دیر کے لئے آنکھ بند کر کے اندر غصّے کی لذّت کو محسوس کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے اندر کی تازگی ختم ہو چکی ہے۔ اور حلق سے لے کر چھاتی تک ایک باسا پن ایک سوکھا پن ہے۔ اس لئے غصّے کے وقت آدمی کو زیادہ پیاس لگتی ہے۔ اگر غصّے کے مقابلے میں ہم پیار کی لذّت کو محسوس کریں تو ایسا محسوس ہوگا۔ گویا انجانی ان دیکھی میٹھی مصری ہمارے اندر گھل رہی ہے۔

راز:

میرا جینا ہی مرنا ہے میرا مرنا ہی جینا ہے
یہاں مرنے سے پہلے بقا کا سامان لایا ہوں ٭

ہم روز روز جینے کے نام پر مر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ موت اچانک آئے گی۔ پر موت کبھی اچانک نہیں آتی اس کائنات میں کچھ بھی اچانک نہیں ہوتا۔ موت بھی اچانک نہیں آئے گی۔ بلکہ روز روز ترقی پاتی ہے موت کوئی اچانک ہونے والا حادثہ نہیں درحقیقت ایک لمبا عمل (PROSESS) ہے۔ پیدائش سے ہی مرنا شروع ہو جاتا ہے۔ پیدا ہوتے ہی ہماری ناف کو کاٹا جاتا ہے۔ موت کی شروعات ہی ناف سے ہوتی ہے۔ مرنے کے دن وہ عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ موت حادثہ نہیں بلکہ ترقی پذیر چیز ہے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ موت مستقبل میں ہوگی بلکہ ابھی ہو رہی ہے۔ ہم گھنٹہ بھر بیٹھے

ہیں تو ہم گھنٹہ بھر اور مر چکے ہوں گے ۔ زندگی کا ایک گھنٹہ کم ہو جائے گا ۔ دوسری بات موت کوئی باہری حادثہ بھی نہیں ہے کہ ہمارے اوپر سے یا باہر سے آجاتی ہو بلکہ موت کا ظہور بھی ہمارے اندر ہی ہوتا ہے ۔ اگر یہ بات ہمارے سمجھ میں آجائے کہ موت اچانک نہیں بلکہ ایک لمبا عمل ہے اور موت کبھی باہر سے نہیں آتی بلکہ اندر ہی ہوتی ہے اگر یہ بات خیال میں آجائے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ہماری پوری زندگی روز روز کئی شکلوں میں مرتی ہے ۔ آنکھ دیکھ دیکھ مٹتی ہے اور فنا ہوتی ہے ۔ کان سن سن کر فنا ہوتے ہیں ۔ قوّتِ لذّت روز لذّت لے لے کے بکھر جاتی ہے ۔ مرتے ہیں ہم جی جی کر ۔ مرنا ہی ہمارے جینے کا انتظام ہے ۔ اسی میں ہم گھس جاتے ہیں اسی میں ہمارے تمام اعضاء اکھڑ جاتے ہیں ۔ ٹوٹ جاتے ہیں جس طرح کوئی آلہ مسلسل کام کرتے کرتے گھس جاتا ہے ٹوٹ جاتا ہے ۔ بڑے مزے کی بات ہے کہ آنکھ کی موت اس کے دیکھنے میں ہے جبکہ آنکھ کو اسی لیے بنایا گیا کہ وہ دیکھے ۔ آنکھ ہمیشہ رنگ و روغن کو دیکھنے کے لئے تڑپتی ہے کیوں کہ یہی آنکھ کی غذا ہے ۔ آنکھ دیکھ دیکھ کر تھک جاتی ہے ایک آلے کے مانند گھس جاتی ہے پھر استعمال کے لائق نہیں رہ جاتی ۔ بڑھاپے کی وجہ سے آنکھ کم دیکھتی ہے ایسا نہیں بلکہ بہت دیکھ چکی ہے اس لئے کم دیکھتی ہے ۔ بوڑھے کے کان بوڑھے ہونے کے وجہ سے نہیں سنتے ایسا نہیں ہے بہت سن چکے ہوتے ہیں کام کر چکے ہوتے ہیں تھک گئے ہوتے ہیں آرام کا لمحہ آگیا ہوتا ہے کان کا آلہ استعمال میں پوری طرح سے آچکا ہوتا ہے ۔ اس کے یہی معنی ہوئے کہ جتنا آنکھ دیکھتی ہے اتنا ہی وہ مرتی ہے جتنا کان سنتا ہے اتنا ہی کان بے کار ہو جاتا ہے ۔ جتنا ہم چھوتے ہیں اتنا ہی

چھونے کی قوّت فنا ہوتی ہے۔ جتنا ہم لذّت لیتے ہیں اتنا ہی لذّت کی قوّت بکھر جاتی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ ہر حواس اپنی موت کی کوشش میں لگا ہے۔ ہماری پوری زندگی خودکشی کے طرز پر ہے۔ دو تین گھنٹے کمپوٹر پر یا فلم دیکھنے سے آنکھ تھک جاتی ہے جبکہ آنکھ کا کام ہی دیکھنا ہے۔ پھر اس کی تھکان کی وجہ کیا ہے تو ذرا غور کرنا، جب ہم کمپوٹر یا فلم دیکھتے رہتے ہیں تو آنکھ مسلسل کھلی رہتی ہے جبکہ آنکھ دن بھر میں پلک جھپکتی رہتی ہے جس سے وہ بار بار تازی ہوجاتی ہیں پلک کا جھپکنا دیکھنے کے سلسلے کو توڑ دیتا ہے۔ کئی مصّور اندھے ہوجاتے ہیں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ روز روز رنگوں کو دیکھنے کی مشق سے آنکھوں کو دیکھنے میں اضافہ ہونا چاہئے تھا۔ کیوں کہ آدمی روزانہ کی مشق سے اور تیز ہوجاتا ہے۔ مگر حواس کا معاملہ کچھ الٹا ہوتا ہے کیوں کہ جس حواس کا ہم زیادہ استعمال کرتے ہیں وہ حواس اوروں کے مقابلے میں جلدی مرجاتا ہے مگر ہمارے بزرگوں کے پاس ان حواسوں کو جوان رکھنے کا راز موجود ہے۔ جس آدمی نے بھی اپنے حواس کو تازہ اور جوان رکھا ہو وہ مرتے وقت بھی موت کی لذّت لے سکتا ہے۔ موت کے رنگ کو دیکھ سکتا ہے۔ وہ موت کو بھی چھوسکتا ہے۔ وہ موت کو بھی محسوس کرسکتا ہے۔ لیکن ہمارے مرنے سے پہلے ہی ہمارے حواس مرچکے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں موت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے حواس کے بدولت ہی ہماری یادداشت سلامت رہتی ہے اسی لئے مرتے وقت یاداشت کھوجاتی ہے۔ اسی لئے آج بھی ہم اس سوال کو دوہراتے ہیں کہ موت کیا ہے؟ ہمارے حواس میں اتنی بھی بیداری نہیں ہے کہ ہم روزانہ ہونے والی موت کو بھی محسوس کرسکیں۔ جسے اس کی ہلکی

سی بھی خبر ہو جاتی ہے وہ بقا کا راز پانے نکل جاتا ہے۔ جو موت کی لذّت کو محسوس نہیں کر سکتا وہ زندگی کی لذّت کو کبھی بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ ہمارے پر حواس ہمارے دو ہرے راستے ہیں۔ ہر حواس کے دو رُخ ہیں۔ جیسے ہماری آنکھ باہر بھی دیکھ سکتی ہے اور ہماری آنکھ کے اندر وہ آنکھ بھی ہے جو اندر بھی دیکھ سکتی ہے۔ ہمارے کان باہر بھی سنتے ہیں اور کان کے پاس ایک باطنی کان بھی ہے جو اندر بھی سنتا ہے۔ اگر ہم باہر کے کان کو پوری طرح سے بند کر لیں تو ہمیں ایک دھک دھک کی آواز صاف سنائی دے گی جو کہ ہمارے دل کی آواز ہے۔ اسی طرح ہم آنکھ کو بند کر لیں تو وہ رنگ بھی دکھائی دیں گے جو باہر نظر نہیں آتے۔ ٹھیک اسی طرح ہر حواس ہمارے اندر محسوس کرنے کا تجربہ رکھتا ہے۔ چونکہ ہم باہر اس قدر الجھے رہتے ہیں کہ ہم بھول ہی جاتے ہیں کہ اندر بھی باطنی حواس کے تجربے کا بھی ایک عالم تھا جو بنا کھلے ہی رہ گیا۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ آنکھ باہر کے رنگوں کو دیکھ دیکھ کر اندھی ہو جائے گی مگر جو باطن کی آنکھ ہے وہ بھی بنا کھلے ہی رہ جائے گی۔ اسی لئے ہر بزرگ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آنکھ بند کر کان بند کر لب بند کر یعنی اپنے حواس ظاہرہ کو بند کر کیوں کہ ظاہر کی آنکھ بند کرتے ہی باطن کی آنکھ حرکت میں آجاتی ہے باہر کے کان کو جو آرام دے گا وہ باطن کے کان سے صوت سرمدی سن سکتا ہے۔ مراقبہ کی حالت عین شکم مادر کی حالت ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اس کے قدرتی طور پر حواس ظاہرہ بند رہتے ہیں اور حواس باطنہ کھلے رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ماں کی ہر حرکت کا باطنی طور پر احساس کر لیتا ہے جتنا زندہ وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اتنا زندہ وہ دنیا میں آکر نہیں رہتا۔ بچہ ماں کے

پیٹ میں ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی آبِ حیات کے دریا میں ہو۔ جس مراقبے میں ایسی کیفیت نہ ہو وہ مراقبہ۔ مراقبہ نہیں ہوسکتا بلکہ کچھ اور ہوسکتا ہے۔ جس آب حیات کا ہم نے نام سنا تھا اس کی لذّت عین مراقبے کی حالت میں ملتی ہے کہ جو مرتا ہے وہ میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرا آلۂ جسم ہے۔ میری موت ناممکن ہے۔ مراقبہ حیات وموت کا خلاصہ ہے۔ بہرحال کسی آدمی کے ایک حواس میں خرابی ہوجائے تو دیگر اس کے حواس خود بخود تیز ہوجاتے ہیں۔ مثلاً کوئی اندھا آدمی ہے مگر اس کے سننے کی طاقت دیگر آدمیوں سے زیادہ ہوگی۔ اس کی محسوس کرنے کی قوّت دیگر سے زیادہ ہوگی۔ کیوں کہ اس کی ایک حواس کی قوّت دیگر چار حواسوں میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ انسان کے مدمقابل پرندوں میں تین حواس ہوتے ہیں جن سے پانچ حواس کا کام لینا ہے۔ اس لئے پرندوں کے حواس انسانوں کے حواس سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایبا کیڑا جس کے پاس صرف ایک ہی حواس ہوتا ہے اس کا چھونے کا عالم پھر کیا ہوگا ٹھیک اسی طرح جب ہم حواس ظاہرہ کو بند کردیتے تو حواس ظاہرہ کی تمام قوّت حواس باطنہ میں منتقل ہوجاتی ہے۔ اسی سے اندازہ لگائیں کہ پھر باطنی حواس کا عالم کیا ہوگا۔ جتنی دیکھنے کی ضرورت ہے اتنا دیکھیں اگر ضرورت نہ ہو تو آنکھیں بند کرلیں ٹھیک اسی طرح ہر حواس کا استعمال کریں تاکہ یہ قوّت سفرِ باطن میں کام آئے۔

قول: ظاہری حواس کی قوّت کو بھی بلاوجہ خرچ کرنا اسرافِ عظیم ہے۔

نکتہ: خواہش کو چھوڑنے کی خواہش بھی نئی خواہش کو پیدا کرتی ہے۔ جب ہم خواہش سے خواہش کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو خواہش اور تیز

ہو جاتی ہے۔ اگر ہم خواہش کو چھوڑنے کی بجائے خواہش کو سمجھنے کی کوشش کریں تو تب ہمیں خواہش چھوڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ خواہش خود بخود کھو جاتی ہے۔

قول :اجالے نے ہی اندھیرے کو پیدا کیا ہے۔ جب تک اجالا نہ تھا۔ تب تک اندھیرے کا وجود ہی نہ تھا۔

قول :سیاست خراب نہیں بلکہ سیاست ہمیشہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں گئی جو خراب ہی تھے۔ جنھوں نے سیاست کا غلط استعمال کیا جس کی وجہ سے سیاست بدنام ہو گئی۔

نکتہ :میں کو مٹایا نہیں جا سکتا کیوں کہ ہم جس کو مٹانے نکلتے ہیں اس کو ہم اپنی پوری طاقت دے دیتے ہیں جس کی بدولت وہ اور طاقتور بن جاتا ہے۔ اور ہم اس کو مٹانے نکلتے ہیں جو ہے ہی نہیں۔ میں کو مٹانے کی کوشش ہی میں کو زندہ رکھتی ہے۔ میں کو مٹایا تو نہیں جا سکتا۔ ہاں! میں کو جانا جا سکتا ہے۔ میں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ میں کیا ہے اور میں کہاں ہے۔

ریاض : خیال کریں کہ ہمارے وجود کے اندر ایک ترازو ہے جس کے دو پلے ہماری چھاتی کی اور ہے جس کا کانٹا ہمارے دونوں ابروں کے درمیان ہے اور جس کا پکڑنے کا آخری سرا (حوک) ہمارے دماغ میں ہے۔ جب یہ ترازو وجود میں قائم ہو جائے تو پھر اس پر ہمیشہ نظر رکھیں کہ کوئی حرکت تو نہیں ہو رہی ہے۔ کوئی پلہ نیچے اوپر تو نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے اندر کسی بھی قسم کی تبدیلی آتے ہی پلہ نیچے اوپر ہونا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی ہماری تعریف کرے یا ہمیں کوئی گالی دے تو فوراً ترازو حرکت میں آجاتا ہے۔ اس لئے

ہمیشہ خیال جمائیں کہ دونوں پلے برابر رہیں۔ اگر کسی قسم کی تبدیلی ہوتی ہے تو فوراً ترازو پر خیال کو جماتے ہی دونوں پلے ساکت ہو جاتے ہیں۔

قول :خدا اتنا بڑا ہے کہ اس کے بارے میں بھی بتانے کے لئے الفاظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

نکتہ :ہمارے ہر الفاظ ادھورے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کیا جانا ہے وہ پورا ہے یعنی خدا۔ اور کوئی الفاظ پورے ہو بھی نہیں سکتے۔ کیوں کہ لفظ جس عقل سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ادھوری ہے۔ اور عقل بھی پوری ہو نہیں سکتی۔ کیوں کہ ہمارا وجود کل کی حیثیت رکھتا ہے اور عقل جز ہے۔ ہماری زندگی کا عقل ایک چھوٹا سا حصّہ ہے۔ عقل سے بڑے ہیں ہم عقل سے وسیع ہیں ہم ۔ ہمارا جو ہونا ہے اس میں عقل بھی ایک بوند ہے۔ لیکن وہ ہمارا پورا سمندر نہیں ۔اس لئے جز سے جو بھی پیدا ہوگا وہ جز ہی ہوگا۔ چھوٹا ہی ہوگا بڑا ہو نہیں سکتا۔ دوسری بات ہمارے ہر الفاظ حواس سے متاثر ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے حواس بھی محدود ہیں ۔ اور جس کو محسوس کیا جانا ہے وہ لامحدود ہے۔ حقیقت میں ہماری آنکھ اتنی چھوٹی ہے کہ ہمیں ہر چیز ٹکڑوں میں دیکھنی پڑتی ہے۔ کسی بھی چیز کو ہماری آنکھ بیک وقت ایک ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ ٹھیک اسی طرح ہمارے ہر حواس اور ان کے تجربات کا بھی یہی حال ہے۔ اسی لئے الفاظ بھی جن حواس سے متاثر ہوتے ہیں وہ بھی محدود کی ہی خبر دے سکتے ہیں لامحدود کی نہیں ۔ لامحدود کو حد میں باندھنا گویا لامحدود میں نقص پیدا کرنا ہے۔ ہر الفاظ ہماری سوچ کا اظہار کرتے ہیں اور سوچ دوئی کا مصدر ہے۔ اسی لئے ہمارے ہر الفاظ میں دوئی کی بو ہوگی۔ ہمارے کوئی الفاظ وہاں تک نہیں پہنچ پاتے جیسے

کے خدا کا ہونا ہے۔اس لئے جب بھی ہم خدا کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں تو لفظ چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

نکتہ :رہبر کے معنی ہیں درمیان میں کھڑا ہوا انسان۔جو تمھارے بیچ ہوتے ہوئے بھی تم سے بہت دور وہ تم جیسا بھی ہے اور تم جیسا بالکل نہیں۔جو دنیا کی قید میں ہوتے ہوئے بھی پوری طرح آزاد۔

نکتہ:ہر پیدا ہونے والے بچے کو پیدا ہونا گویا موت کی طرح ہی معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ جس ماں کے پیٹ میں وہ نو ماہ رہا۔جسے اس نے زندگی سمجھا تھا وہ زندگی ختم پر آ گئی۔اور آگے کی زندگی کا بچے کو کچھ پتہ نہیں۔ آگے تو خوف ہے کہ پیٹ کے اندر کا سارا آرام سارا عیش،سب سکھ چھین رہا ہے۔اور اسے آگے کا تو پتہ نہیں۔اس کی دنیا سے اسے اکھاڑا جا رہا ہے۔ سب جڑیں ٹوٹ جائیں گی۔جسے ہم پیدا ہونا کہتے ہیں۔وہ بچے کے لئے انتقال ہے اور موت سے پہلے ہی آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے اس لئے بچہ بیہوشی کی طرح پیدا ہوتا ہے۔

نمودِ نخل کثرت پائمال تخم و حدت ہے
سمجھتے ہیں جسے مولود ہم وہ عین رحلت ہے

قول :بھول (غلطی) گھڑی کی پنڈولیم کی طرح ہے۔اگر ایک چھوڑ سے بچ گیا تو دوسرے چھوڑ پر ہونا ہی ہے۔

قول:انسان جینا بھی چاہتا ہے اور مرنا بھی چاہتا ہے۔

قول:انسان میں مرنے کی خواہش بھی چھپی ہوئی ہے۔

قول:خوبصورتی ایک راز ہے۔

نکتہ :ایک پھول کھلتا ہے ہم کہتے ہیں کہ خوبصورت ہے۔ایک چاند نکلتا ہے ہم کہتے ہیں خوبصورت ہے۔کوئی چہرہ اچھا لگتا ہے کہتے ہیں خوبصورت ہے۔کوئی غزل دل کو چھوتی ہے کہتے ہیں خوبصورت ہے۔لیکن کیا آپ نے کبھی خوبصورتی کو دیکھا ہے۔آپ نے خوبصورت چیزیں دیکھیں ہیں۔مگر جو خوبصورتی ہے اس کو جانا ہے۔اس کو دیکھا ہے اگر نہیں دیکھا ہے تو پھر کسی چیز کو آپ خوبصورت کسے کہتے ہیں۔پھول میں آپ کو خوبصورتی نظر آتی ہے مگر خوبصورتی کو نہیں دیکھا۔پھول میں خوبصورتی صبح کھلتی ہے اور شام ہوتے ہوتے کھو جاتی ہے۔ایک چہرہ میں خوبصورتی دکھتی ہے اور کل یہ گم ہو جائے گی جو آج تک تھا کل کھو جائیگا۔جو صبح دکھا تھا شام ڈوب جائے گا۔کیا اسے چیزوں سے الگ کر کے دیکھا؟ کیا آپ نے کبھی خالص خوبصورتی دیکھی ہے؟ آپ نے خوبصورت چیزیں دیکھی ہیں۔خوبصورتی کو نہیں دیکھا۔ پھول کی ترجمانی ہو سکتی ہے اس کی حد ہے۔اس کا آکار ہے۔بناوٹ ہے، پہچان ہے مگر خوبصورتی کی ترجمانی نہیں ہو سکتی۔کیوں کہ اس کی کوئی حد نہیں، بناوٹ نہیں، پہچان نہیں اور پھر بھی ہم پہچانتے ہیں۔اگر پہچان نہ ہوتی تو ہم پھول کو خوبصورت کیسے کہہ سکتے ہیں۔اگر پھول ہی خوبصورت ہے تو پھر رات کا چاند خوبصورت نہ ہو سکے گا۔پھول اور چاند میں کیا تعلق ہے۔اگر چاند ہی خوبصورت ہے۔تو کسی آنکھ کو خوبصورت نہ کہہ سکو گے۔خوبصورتی کچھ ہے جو پھول میں بھی ہے چاند میں بھی ہے آنکھ میں بھی ہے۔خوبصورتی کچھ اور ہے جو آنکھ سے الگ ہے۔چاند سے الگ ہے۔پھول سے الگ ہے۔آنکھ جو ابھی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی ابھی غصّے سے بھر جائے تو بدصورت ہو جائے

گی۔نفرت سے بھر جائے تو بدصورت ہو جائے گی۔آنکھ وہی رہے گی مگر کچھ کھو جائے گا، تو یقیناً خوبصورتی نہ تو چاند ہے نہ پھول ہے نہ آنکھ ہے۔ خوبصورتی کچھ اور ہے۔لیکن خوبصورتی کو کبھی دیکھا، کبھی آمنے سامنے دیکھا کبھی خوبصورتی سے ملاقات ہوئی۔خوبصورتی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔نہ دیکھا نہ جانا۔خوبصورتی کی بات کچھ اور ہے پھر بھی خوبصورتی کو ہم پہچانتے ہیں۔جب پھول میں وہ اترتا ہے راز۔جب وہ راز پھول میں نظر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ پھول خوبصورت ہے۔وہ راز جب کسی آنکھ میں جھلکتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آنکھ خوبصورت ہے۔وہ راز جب کسی کلام میں ظاہر ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ کلام خوبصورت ہے۔

کسی انجانے راستے سے ہماری اس کی ملاقات بھی ہوتی ہے۔کسی انجان راستے سے وہ ہمارے دل میں اتر بھی جاتا ہے کسی انجان راستے سے ہماری روح کو بھی چھو لیتا ہے۔مگر کیا ہے وہ، جس کو ہمارا دل محسوس کر لیتا ہے ہماری روح چھو لیتی ہے اور پھر بھی ہماری عقل جس کو پکڑ نہیں پاتی۔اس کا احاطہ نہیں کر پاتی۔دماغ جس کے پکڑنے میں ناکامیاب رہتا ہے۔جو خرد کے ہاتھ سے ہمیشہ کھو جاتی ہے۔کیونکہ عقل ایک محدود چیز ہے اور وہ محدود چیز سے ہی واقف ہو سکتی ہے۔وہ محدود کو ہی جان سکتی ہے پہچان سکتی ہے۔عقل کسی چیز کی پیمائش کرنے کے لئے اس کی ابتداد یکھتی ہے اور انتہا دیکھتی ہے کہ یہ شروع کہاں سے ہے اور اس کا خاتمہ کہاں پر ہے۔عقل کی اسی محدودیت کی وجہ سے ہر چیز ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے اور ٹکڑوں میں بنٹی چلی جاتی ہے۔عقل جو پیدا ہوتا ہے اور جو مرتا ہے اسے جان سکتی ہے۔پھول پیدا ہوتا ہے اور اس

کو پیدا کرنے کے ہزاروں راستے بھی ہیں ۔ مگر خوبصورتی کو پیدا کرنے کا ایک بھی راستہ نہیں ۔ اس لئے جسے پیدا نہیں کیا جاسکتا اسے مارا بھی نہیں جاسکتا ہے ۔ پھول مرسکتا ہے مگر خوبصورتی نہیں مرسکتی ۔ پھول محدود اور خوبصورتی لامحدود ہے ۔ اس لئے خوبصورتی کے راز کو عقل جان نہیں پاتی اور بھٹکتے رہتی ہے ۔

قول : اللہ کی خوبصورتی کا نام محمدؐ ہے ۔ اور محمدؐ حیات النّبی ہیں اور حیات النّبی خوبصورتی ہے ۔

آیت قرآنی : اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی سے محبت کرتا ہے ۔

نکتہ: کوئی تو ہے جو ہمیشہ سے تھا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا ۔ سورج طلوع ہوتا رہے گا اور ڈوبتا رہے گا ۔ دنیا بنتے رہے گی اور مٹتی رہے گی مگر کچھ ہے جو سورج نکلنے سے پہلے بھی تھا اور ڈوب جانے کے بعد رہے گا ۔ کچھ ہے جو دنیا بننے سے پہلے بھی تھا اور بعد میں بھی رہے گا ۔ لوگ پیدا ہوتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے ۔

کچھ ایسا ہے ہے جسے نہ پیدا کیا جاسکتا ہے نہ مارا جاسکتا ہے جو ہمیشہ ہی رہے گا ۔ وہ ہے خالص ''وجود'' ہم نے کبھی وجود نہیں دیکھا ۔ ہم نے ایک درخت دیکھا جس کا وجود ہے ۔ ہم نے ایک ندی دیکھی جس کا وجود ہے ۔ ہم نے ایک آدمی دیکھا جس کا وجود ہے ۔ ہم نے ایک سورج دیکھا جس کا وجود ہے ۔ مگر وجود ہم نے کبھی نہیں دیکھا ۔ ہم نے چیزیں دیکھی ہیں جو ''ہیں'' مگر چیزیں کھو جائے گی ۔ مثلاً ایک ٹیبل ہے ہم کہتے ہیں کہ ''ہے'' ایک آدمی

ہے ہم کہتے ہیں کہ ''ہے'' ایک مکان ہے ہم کہتے ہیں کہ ''ہے''۔ ٹیبل ہے، آدمی ہے، پھول ہے، مکان ہے، سورج ہے۔ یہ ''ہے'' وجود کیا ہے؟ جو ٹیبل میں بھی ہے۔ آدمی میں بھی ہے۔ سورج میں بھی ہے۔ ہم نے آدمی دیکھا، سورج دیکھا، ٹیبل دیکھا۔ مگر جو ''ہے پن'' ہے جو ''وجود'' ہے وہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ سمجھے ٹیبل کو ہم نے توڑ دیا۔ ہم نے دو چیزیں کہی تھیں ایک ''ٹیبل'' دوسرا ''ہے'' ہم نے ٹیبل کو تو ختم کر دیا تو کیا ہم نے اسکی دوسری چیز اس کے ہونے کو بھی ختم کر دیا۔ پھول تھا اب کہتے ہیں نہیں ہے۔ پھول کو ہم نے مٹا دیا تو کیا پھول کے اندر جو ہونا تھا وجود تھا اسے بھی ہم نے مٹا دیا۔ وجود کو کبھی ہم نے دیکھا نہیں۔ ہم نے صرف چیزیں دیکھیں ہیں۔ ایک آدمی تھا مر گیا۔ آدمی ہے اس میں دو چیزیں تھیں۔ آدمی تھا اس میں ہڈی، گوشت پوست۔ عقل جسم، دل اور ہونا تھا۔ وجود تھا ہڈی ٹوٹ گئی۔ جسم گل گیا مٹی ہو گیا مگر ''ہے'' جو ہونا تھا کیا وہ گل گیا مٹ گیا لیکن ''ہے''۔ اگر ایک پھول کو ہم مٹاتے ہیں تو بس اس پھول کو ہی مٹاتے ہیں اس کی خوبصورتی کو نہیں جس خوبصورتی کو ہم نے دیکھا نہیں۔ اس کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں۔ جس کو ہم کبھی پکڑ نہ سکے جس کو چھو نہ سکے اس کو ختم بھی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ''وجود'' کو بھی ہم نے دیکھا نہیں اس لئے وجود کو بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پیدا ہوتے ہیں مر جاتے ہیں۔ قبر میں دفن ہو جاتے ہیں مگر جو ان کے اندر ہونا تھا۔ جو وجود تھا۔ وہ ہمیشہ ہے۔ وہ ہمیشہ رواں رہے گا۔ وہی ہے جو کسی کے پیدا ہونے سے پیدا نہیں ہوتا جو کسی کے مرنے سے نہیں مرتا۔ ہم اس کی حد بندی کر سکتے ہیں کہ فلاں دن فلاں تاریخ کو پیدا ہوا اور فلاں دن اور فلاں

تاریخ کو مرا۔ اسی اعتبار سے اس کی عمر کا تعین کرتے ہیں۔ یہ ایک فلاں آدمی کی حد تعین ہے مگر زندگی کی نہیں۔ تھوڑا گہرائی میں اتر کر دیکھیں کہ جس سے ہمیں شاید پتہ چلے۔ پیدائش پر بھی کچھ اختلاف ہے کہ ہم کس دن کو پیدائش کا دن منائیں۔ جس دن بچہ پیدا ہوتا ہے اس دن یا جس دن حمل ٹھہرتا ہے اس دن۔ عام طور پر جب بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے ہم اس دن کو پیدائش کا دن مانتے ہیں۔ لیکن جس دن بچہ ماں کے پیٹ میں آتا ہے وہ تو تھوڑا پیچھے چلیں۔ ٹھیک پیدائش کا دن تو وہی ہے۔ جب بچہ ماں کے پیٹ میں آتا ہے۔ پیدا تو اسی وقت ہو گیا۔ لیکن تھوڑا اور گہرائی میں اتریں۔ ماں کے پیٹ میں جس دن بچہ کی تعمیر ہوتی ہے اور اس کا پہلا ''خلیہ'' بنتا ہے تو اس میں کا آدھا حصّہ تو زندہ تھا باپ میں بہت پہلے ہی سے اور اسکا آدھا حصّہ زندہ تھا ماں میں بہت پہلے ہی سے۔ تو یہ پیدائش کا واقعہ دو زندگانی جو پہلے ہی سے موجود تھے ان کے ملن کا یہ واقعہ ہے۔ مگر یہ بھی شروعات نہیں بلکہ زندگی دونوں موجود تھے۔ ایک باپ میں پوشیدہ تھی ایک ماں میں پوشیدہ تھی۔ ان دونوں کے ملنے سے زندگی شروع ہوئی۔ اس سے محض ایک نام کی شروعات ہوگئی مگر یہ زندگی کی شروعات نہیں ہے کیوں کہ زندگی باپ میں پوشیدہ تھی ماں میں پوشیدہ تھی موجود تھی پوری طرح زندہ تھی تو یہ ملنے سے ظاہر ہوئی لیکن موجود تھی۔ تھوڑا اور پیچھے چلیں جو باپ میں چھپا تھا۔ وہ باپ کے ماں باپ میں چھپا تھا۔ اور چلتے جائیں۔ جو ماں میں چھپا تھا وہ ماں کے ماں باپ میں چھپا تھا۔ یہ زندگی کب شروع ہوئی آپ کی پیدائش آپ کی پیدائش ہو سکتی ہے۔ لیکن آپ کے اندر جو زندگی ہے اس کی پیدائش نہیں۔ اگر اس سے ہم پیچھے لوٹائیں تو تمام تواریخ،

معلوم نا معلوم اس میں ضم ہوسکتی ہے۔ روئے زمین پر جو پہلا آدمی تھا ہم اس میں زندہ تھے لیکن وہ پہلا آدمی بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ پہلے آدمی کے ہونے کے لئے بھی ضروری ہے کہ زندگی اس سے پہلے موجود ہو۔ اب ذرا مذہب کے اعتبار سے دیکھیں۔ مذہب کہتا ہے کہ ماں باپ کے ملن سے جو چیز بنی وہ صرف جسم کی زندگی ہے اور روح اس میں داخل ہوگئی۔ ماں کے پیٹ میں جو واقعہ گزر رہا ہے وہ بھی ازلی ہے اور روح کا جو واقعہ گزر رہا ہے وہ بھی ازلی ہے ۔یعنی دو ازل کا ماں کے پیٹ میں ملاپ ہو رہا ہے۔ میں ہمیشہ تھا اس معنی میں ۔میرے جسم کا ذرّہ ذرّہ موجود تھا۔ میری روحانیت کا ذرہ ذرہ موجود تھا۔ ایسا کوئی بھی لمحہ نہیں تھا جب میں نہ تھا۔ اس وجود میں۔ شکل کچھ بھی رہی ہو۔ بناوٹ کچھ بھی رہا ہو۔ نام کچھ بھی رہا ہو۔ ایسا کوئی لمحہ نہیں تھا وجود میں جب ہم نہ رہے ہوں۔ اور ایسا بھی لمحہ کوئی نہیں ہوگا جب ہم نہیں ہوں گے۔

قول :بیٹا باپ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر باپ بیٹے کو پیدا نہیں کرسکتا ہے۔

قول :آدم علیہ السلام سے پہلے بھی ذات آدم علیہ السلام روئے زمین پر موجود تھی۔

نکتہ :سمجھ اٹھارہ سال یا کم از کم تیرہ سال میں پوری ہوجاتی ہے۔ ایک اٹھارہ سال کے جوان اور ایک (۸۰) سال کے بوڑھے آدمی کی سمجھ تقریباً ایک ہی ہوتی ہے۔ محض جانکاریوں (معلومات) کا فرق ہوتا ہے۔ اٹھارہ سال کے جوان کی جانکاری کم ہوگی بہ نسبت (۸۰) سال کے بوڑھے کے۔ مگر سمجھ اتنی ہی ہوگی۔ سمجھ میں کسی قسم کا فرق نہ ہوگا۔ مثلاً لڑکا ایک سے ہزار تک گنتی جانتا تھا۔ پھر اسے ایک ہزار سے دس ہزار تک گنتی سکھائی گئی۔

اب اس لڑکے کی جانکاری میں اور اضافہ ہوا اور اضافہ کرایا جاسکتا ہے مگر اب بھی سمجھ میں کسی قسم کا فرق واقع نا ہوا۔ اسی طرح تا عمر آخر جانکاریوں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ کچھ لوگ جانکاریوں کو ہی علم سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جتنی جانکاری ہے اتنا علم ہے۔ حالانکہ علم اور جانکاری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جانکاری ہمیشہ دوسروں سے حاصل ہوتی ہے اور باہر سے آتی ہے۔ اور علم اندر سے ہی حاصل ہوتا ہے اور وقت پڑنے پر اپنا ہی علم کام آتا ہے نا کے دوسروں کی جانکاری۔ جانکاری سے غرور بڑھتا ہے اور علم سے خاکساری آتی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں انھیں جانکاری کی یادداشت کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو انھیں پھر ڈگری سے نوازا جاتا ہے۔ جنھیں ہم پھر پڑھا لکھا آدمی مانتے ہیں۔ ڈگری آدمی کو ڈاکٹر بنا سکتی ہے انجینئر بنا سکتی ہے۔ پروفیسر بنا سکتی ہے۔ سائنس داں بنا سکتی ہے مگر صاحب سمجھ نہیں بنا سکتی۔ سمجھ کے دروازے کو اندر کا علم ہی کھول سکتا ہے۔ علم معرفت آدمی کی جانکاریوں کو نہیں بڑھاتا ہے بلکہ آدمی کی سوچ اور سمجھ کو بڑھا دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ سمجھ کو ہی بدل دیتا ہے۔ سمجھ کے بدلتے ہی پورا آدمی بدل جاتا ہے۔

قول : جو نا کامیاب ہوتے ہیں وہ خالی مرتے ہیں اور جو کامیاب ہوتے ہیں وہ اور بھی زیادہ خالی مرتے ہیں۔

قول: انسان میں کچھ ایسا ہے جو کبھی نہیں بھرتا۔

قول : ہر خواہش ادھار ہے اسی لئے آدمی خواہش پوری ہونے کے باوجود پریشان رہتا ہے۔

قول :جہاں سب خواہشات پوری ہو جاتی ہیں اس جگہ کا نام دوزخ ہے۔

قول :انسان جتنا چالاک ہوتا جاتا ہے اس کے اندر کی معصومیت اتنی ہی ختم ہوتی جاتی ہے۔

قول: بیماریاں باہر سے آتی ہیں اور تندرستی اندر سے۔

قول: خوشی اور غم کے بیچ میں اداسی ہے۔

نکتہ: خاموشی سے آنکھ بند کر کے بیٹھ جائیں اور ایک ہی بات کا خیال رکھیں کہ باہر کی کوئی چیز نہیں دیکھیں گے۔ ہماری عادت کی وجہ سے باہر کی صورتیں بہت آئیں گی۔ اور یہ جانتے رہیں کہ یہ تصویریں باہر کی ہیں اور میں دیکھنے کو راضی نہیں۔ میری تیاری دیکھنے کی نہیں ہے میرا کوئی لطف نہیں ہے کوئی کشش نہیں ہے۔ اگر آپ اتنا کر سکتے کہ اندر کا تعلق توڑ لیں باہر کے مزوں سے تو آپ پائیں گے کہ باہر کے خیالات کم ہو جائیں گے۔ وہ آتے ہی اس وجہ سے ہے کہ آپ بلاتے ہیں۔ من میں کوئی بھی مہمان بن بلایا ہوا نہیں ہے۔ من میں کوئی بھی مہمان زبردستی نہیں آ گیا ہے۔ آپ کی دعوت ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے دعوت دے کے بھول گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ دعوت دے کے بدل گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو خیال بھی نہ ہو کہ کب کس لاشعوری کے وقت میں آپ نے دعوت دیا تھا لیکن آپ کے من میں جو بھی آتا ہے وہ آپ کا ہی بلایا ہوا ہے۔ آپ کے من میں جو بھی واقعہ گزرتا ہے جس کے لئے آپ کے علاوہ کوئی اور ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ اگر خواب میں آپ کسی کا قتل کرتے ہیں یا کسی عورت کے ساتھ زنا کرتے ہیں تو یہ آپ کرنا

چاہتے ہوں گے۔ اپنے سے بھی چھپا لیا ہوگا خود کو بھی دھوکا دے لیا ہوگا۔ صبح اٹھ کر آپ کہتے ہیں کہ صرف خواب تھا۔ خواب کا کیا۔ لیکن خواب آپ کے ہیں۔ خواب تیار کیے ہوئے ہیں۔ آپ نے ہی سجائیں ہیں۔ اس لئے خواب کا کیا، ایسا بھی مت کہنا۔ خواب آپ کا، آئینہ آپ کی جھلک ہے۔ آپ کی خبر ہے۔ آپ کے من کے سطحوں کی خبر ہے۔ یہ من ہے آپ کے پاس دن میں جھوٹ مان لو مگر رات میں یہ من کام کرنے لگتا ہے۔ ماہر نفسیات کہتے ہیں کہ انسان کو خواب نہ آئیں تو انسان پاگل ہو جائیں۔ وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دن بھر آپ جو بھی دبا لیتے ہیں چھپا لیتے ہیں، خواب میں اس کا اخراج ہو جاتا ہے ۔ پہلے لوگ سوچتے تھے کہ اگر ایک آدمی کو زیادہ دن تک سونے نہ دیا جائے تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ لیکن اب ماہر نفسیات یہ کہتے ہیں کہ اصل وجہ یہ نہیں کہ نیند نہیں ملی بلکہ نیند نہ آئے تو وہ خواب نہیں دیکھ پایا جس کی وجہ سے وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ رات میں آدمی بارہ بار خواب دیکھتا ہے۔ بارہ بار خواب میں داخل ہوتے ہیں۔ درمیان کے وقت میں آپ خواب سے باہر ہوتے ہیں یا نیند میں ہوتے ہیں۔ آپ باہر سے بھی دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ آدمی کب سو رہا ہے، اور کب خواب دیکھ رہا ہے، اس کے آنکھ کی پتلی کی رفتار بتا دیتی ہے۔ فلم کو دیکھتے وقت جس طرح آنکھ کی رفتار ہوتی ہے، ٹھیک خواب کو دیکھتے وقت بھی وہ ہی رفتار ہوتی ہے۔ کیوں کہ خواب بھی ایک فلم ہے۔ اس کے آنکھ کی پتلی رک گئی یعنی وہ سو رہا ہے۔ اگر چل رہی ہے تو گویا محو خواب ہے۔ سائنسدانوں نے ایک تجربہ کیا کہ کئی آدمیوں کو عین خوابیدہ حالت میں جگایا گیا۔ تقریباً پندرہ دنوں کے اندر کئی کی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی۔ دوسرا تجربہ

یوں کیا گیا کہ عین حالت نیند میں جگایا گیا۔ مگر کوئی آدمی پاگل نہ ہوا بلکہ کلی طور پر سب درست تھے۔ ان تجربات کی روشنی میں سائنسداں کہتے ہیں کہ نیند کی وجہ سے آدمی پاگل نہیں ہوتا بلکہ اس کی اصل وجہ خواب کا نہ دیکھنا ہے۔ انسان دن بھر میں جو کچھ کچرا اکٹھا کرتا ہے۔ اپنے حالت لاشعوری میں اگر وہ نہ نکل پائے اور کچرا اکھٹا ہوتا چلا جائے تو وہ ہی پاگل پن کی وجہ بن جاتا ہے۔ خواب بلا وجہ نہیں بلکہ آپ ہی کے ہیں، اپنے خواب ہیں۔ اگر آپ آنکھ بند کرتے ہیں اور تصویریں آنا شروع ہو جاتی ہیں، ان میں آپ کو مزہ ملتا ہے۔ اسی لیے آتے ہیں۔

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ پہلا کام اس مزے کو توڑ دیں۔ تصویریں آئے تو دیکھیں مگر بے مزہ ہو جائے۔ غیر متحرک ہو جائیں۔ مثلاً ایک آدمی فلم دیکھ رہا ہو اور کافی مزہ بھی لے رہا ہو اتنے میں کوئی ڈاکٹر آئے اور کہے کہ تمھاری جانچ سے پتہ چلا کہ تم کو کینسر ہے اور تم کچھ ہی دنوں کے مہمان ہو، ابھی بھی وہ آدمی فلم دیکھ رہا ہوگا مگر جو دیکھنے کا مزہ تھا وہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جب آپ تصویروں سے بے مزہ ہو جائیں گے تو تصویریں آنا کم ہو جائیں گی۔ تصویریں پرانی عادت کی وجہ سے آئیں گی ضرور مگر جڑیں کھوکھلی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ درمیان میں ایک خالی پن ایک وقفہ ہوگا۔ جب ایسا وقت آئے گا تب آپ کی نظر خود پر ہوگی۔ تب آپ دیکھیں گے کہ آپ کا چراغ آپ کو روشن کر رہا ہے۔ آپ کے وجود کی لو آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔ یہ وہ ہی چراغ اور وہ ہی لو ہے جو اب تک دوسروں کو ظاہر کر رہا تھا۔ جب دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تب چراغ کی روشنی خود پر پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کان بند

کر کے بیٹھ جائیں ، باہر کی آوازیں آئیں گی مگر آپ بے لطف بد مزہ ہو جائیں۔ کچھ ہی دنوں میں ساری آوازیں خاموش ہو جائیں گی اور اسی دن اندر کا سناٹا سنائی دے گا۔ ہر حواس کو اندر کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ خوشبو اندر کی بھی ایک خوشبو ہے۔ اس کا ہمیں کوئی پتہ نہیں۔ شاید وہ ہی اصل خوشبو ہے ۔لیکن باہر کی خوشبوؤں نے ہمارے ناک کے نتھنے کو اس قدر بھر دیئے کہ ہمیں یاد بھی نہیں رہ جاتا کہ روح کی بھی کوئی خوشبو ہے۔ کوئی سانس اندر کی بھی ہے ۔ ہمارے حواس ہمارے راستے ہیں مگر دوہرے۔ حواس آپ سے بھی جڑے ہیں اور باہر سے بھی، اسی لیے باہر کی خبر تم تک لاتے ہیں۔ مگر ہم لوگ حواس کا استعمال ایک طرفہ راستے کی طرح کر رہے ہیں۔ ہم اس سے محض دنیا کی ہی خبر لے رہے ہیں۔ ہم نے اس سے کبھی بھی اندر کی خبر نہ لی۔ جو اپنے حواس کو باطن کی اور موڑ لیتا ہے وہ راز ہستی سے واقف ہو جاتا ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْعَرَفَ نَفْسَهُ

قول :ہر کوئی ہمیں ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسے ہماری سوچ ہے۔

نکتہ :کسی آدمی کے تعلق سے ہم اگر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ آدمی اچھا ہے تو گویا ہمارا عقیدہ ہمارا انتخاب بن جاتا ہے کہ ہم اس آدمی کی اچھائی چن لیتے ہیں اور بُرائی چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی طرح کسی کو بُرا مان لیا تو بھی اس کی اچھائی ہماری نظروں سے چھپ جاتی ہے۔

اشارہ :انسان اندر سے خود کو بند کر رکھا ہے اور اپنے آپ کو باہر سے کھولنا چاہتا ہے اس لئے کھول نہیں پاتا۔

نکتہ: ہر شئے کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) ٹھوس (۲) مائع (۳) گیس

مثلاً: برف پانی کی ٹھوس شکل ہے اور پانی مائع کی شکل ہے اور بھاپ پانی کی گیسی شکل ہے۔

محض چیز ہی نہیں ہمارے الفاظ بھی تین شکل رکھتے ہیں۔ کسی نے ہم کو گالی یا بُرا بھلا کہا تو گویا یہ الفاظ کی ٹھوس شکل ہے جس سے انسان کو چوٹ پہنچتی ہے۔ دوسری شعر، نظم، غزل، کلام وغیرہ یہ الفاظ کی مائع شکل ہے۔ شعر، شاعری، وغیرہ میں ایک طرح کا بہاؤ ہوتا ہے جو کسی پانی میں پایا جاتا ہے۔ کلام میں ایک لفظ کے کئی معنے نکلتے ہیں۔ ہر کوئی کلام کو اپنے خیال اپنی سوچ و مجاز کے موافق سمجھتا ہے اگر اس طرح سے نہ ہو تو یہ پھر کلام نہیں ہو سکتا۔ تیسری خاموشی پُر خاموشی یہ لفظ کی گیس کی شکل ہے۔ جہاں بغیر کہے بھی بات پوری ہو جاتی ہے۔

اشارہ: آدمی جواب پانے کے بعد بھی سوال میں الجھا ہوا رہتا ہے آخر کیوں؟ اگر اس کی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جواب سوال کا ملتا ہے اور یہ جواب پوچھنے والے تک نہیں پہنچ پاتا۔ جبکہ جواب صاحب سوال کو ملنا تھا نہ کہ سوال کو۔ اگر جواب محض سوال کا ہی ہوتا جس طرح علم حساب میں ہر سوال کا جواب بندھا ہوتا ہے۔ جیسے دو اور دو کتنے ہوتے ہیں، جواب ہوگا چار، اسی طرح عدد بدلتے جائیں گے یا حساب کی نشانی بدلتی جائے گی مگر جو اب وہ ہی بندھا ہوگا۔ اگر یہ قاعدہ ٹھیک ہے تو ہر سوال کا جواب بندھا ہونا چاہئے۔ مگر حضور اکرمؐ ایک ہی سوال کا کئی جواب دیتے ہیں ایک سائل وہ ہی سوال کرتا ہے تو جواب کچھ اور ہوتا ہے۔ دوسرا سائل وہ ہی سوال کرتا ہے تو

جواب کچھ اور پاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی سوال کو دیکھ کر جواب نہیں دیتے تھے بلکہ سوال کون پوچھ رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کے اعتبار سے جواب دیتے تھے۔ جیسے کوئی حکیم مریض کی نبض کو دیکھ کر اس کی دوا تجویز کرتا ہو۔ نہ کہ مرض کو سن کر دوا دیتا ہو جیسے کہ آج کل ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اثر کم بلکہ ردّ اثر زیادہ ہو رہا ہے۔ جس کی بدولت مرض ٹھیک ہونے کی بجائے اور بڑھ جاتا ہے جب حکیم ہی نیم ہو تو پھر جان کا خطرہ بنا ہی رہے گا۔ بحرِ کیف جو نا سمجھ ہیں وہ ایک جیسے سوال کا ایک جیسا ہی جواب دیں گے۔ بلکہ وہ اسی جواب کو دہراتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ جواب ان کا نہیں ہوتا بلکہ کسی اور سے یا کسی کتاب سے سکھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی لئے طوطے کی طرح دہرانا پڑتا ہے۔ اس طرح کا دیا ہوا اُدھار جواب محض سوال کی خانہ پوری کر سکتا ہے مگر سائل کو مطمئن نہیں کر سکتا کیوں کہ جواب دینے والا خود مطمئن نہیں ہوتا۔ جو صاحب سمجھ ہیں جو جانتے ہیں کہ سوال ایک جیسا ہو سکتا ہے مگر پوچھنے والا الگ اس کی تجسس الگ ہوگی اس کی روح الگ ہوگی اگر سائل کے اندر جھانک کر دیکھا جائے کہ سوال کہاں سے اٹھا۔ تو پتہ چلے گا کہ سوال تو وہ ہی ایک جیسا ہی ہے مگر سائل کی حالت کے اعتبار سے سوال کا پورا مطلب ہی بدل جائے گا۔ اس لئے جواب سوال کو نہیں بلکہ پوچھنے والے کو ملنا چاہیے۔ کیوں کہ سوال اہم نہیں بلکہ پوچھنے والا اہم ہوتا۔

قول : نا سمجھ کو سوال سنائی پڑتا ہے اور صاحب سمجھ کو پوچھنے والا۔

قول: ادھار جواب کچرے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اشارہ : ہر آدمی سکھ پانا چاہتا ہے اور دکھ کو مٹانا چاہتا ہے۔ پوری

زندگی اس کی اسی جدوجہد میں نکل جاتی ہے۔ دکھ مٹنے کے بجائے۔ دن بہ دن اور بڑھتا چلا جاتا ہے کیوں کہ آدمی سکھ کو دوست اور دکھ کو دشمن جیسے سمجھتا ہے۔ مگر کبھی وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ دکھ میری زندگی میں کیوں آرہا ہے۔ جیسے سائنس داں بارہاں ہونے والے عمل کو نہیں دیکھتے بلکہ یہ عمل کس سائنسی قانون کے تحت ہورہا ہے۔ اس قانون کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سائنسی قانون سے خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسرے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے نیوٹن پر سوتے وقت آم گرا وہ اٹھ کر سوال کرتا ہے کہ ہر چیز نیچے کی ہی طرف کیوں گرتی ہے۔ اس نے گہری تحقیق کر کے اس عمل کا سائنسی قانون ''قوّت جاذبہ'' GRAVITY بنایا جو دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ اگر نیوٹن تحقیق کی بجائے درختوں کو ہی کاٹنے لگتا تو کیا ہوتا۔ مگر انسان اپنے دکھ کے درخت کو کاٹنے لگتا ہے۔ لیکن ذرا بھی تحقیق کرنے تیار نہیں کہ آخر یہ دکھ کی وجہ کیا ہے۔ یہ دکھ کس ''قانون فطرت'' کے تحت مجھ پر گر رہے ہیں۔ دکھ دشمن نہیں بلکہ آپ کا مخبر ہے یعنی خبر دینے والا مثلاً آپ کے پیر میں اگر کچھ چوبھ جائے تو آپ کو درد محسوس ہوگا۔ اگر کوئی اس کا یہ مطلب نکالے کہ درد میرا دشمن ہے تو ذرا سوچیئے پھر پیر کا عالم کیا ہوگا۔ کیا پھر پیر میں زہر نہیں چڑھ جائے گا۔ بالآخر آپ کو اپنے پیر سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ درد آپ کے جسم کی خبر دیتا ہے کہ کچھ غلط ہورہا ہے۔ درد آپ کی توجہ کو اس حصے کی طرف متوجہ کراتا ہے پھر بھی اگر آپ توجہ نہ کریں تو درد اور بڑھ جاتا ہے۔ یعنی درد کی شدت توجہ کو شدت سے توجہ کرنے کی دعوت دیتی ہے مگر ہم اس کے بالمقابل توجہ کی بجائے درد کو ہی مٹانے میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن درد کی وجہ جاننے کی کوشش

نہیں کرتے کہ درد کیوں ہو رہا ہے۔ اگر وجہ کو مٹا دیا جائے تو درد خود بخود مٹ جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سے دکھ بھی توجہ دلانا چاہتا ہے کہ کہیں کسی وجہ سے تم ''قانونِ قدرت'' کے خلاف چل رہے ہو۔ پھر ہمیں قانون قدرت کے تحت آجانا ہے۔ جیسے ہی ہم قانون قدرت کے تحت آجاتے ہیں تو دکھ کو مٹانا نہیں پڑتا بلکہ دکھ خود بخود مٹ جاتا ہے۔ آج سائنسدانوں کی ترقی کا راز یہ ہی ہے کہ وہ قدرت کے خلاف یا قدرت کو قابو کرنے کی بجائے اس کا احترام کرتے ہوئے ایسے ضابطے بناتے ہیں جس سے وہ خود بھی اور اس پر عمل کرنے والے بھی خوش حال رہیں۔

نکتہ : کئی بار کچھ باتیں جنھیں ہم نہیں سمجھتے کام کرتی ہے کیوں کہ ہم انھیں نہیں سمجھ پاتے اس لئے وہ کام کر جاتی ہے۔

قول : موت خاتمہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا مرکزِ کامل ہے۔

قول: موت زندگی کی اہم حالت ہے۔

قول : موت کا دیدار اسی وقت ہوتا ہے جب کسی اپنے کی موت ہوتی ہے۔

قول : صاحب سمجھ دوسروں کی بھول سے بھی سیکھ لیتا ہے اور ناسمجھ خود کی بھول سے بھی کچھ نہیں سیکھتا۔

قول : موت وہ بلندی ہے جہاں سے زندگی کو بہتر ڈھنگ سے دیکھا جاسکتا ہے۔

قول: علم کی دیوار کے آگے چین کی دیوار چھوٹی ہے۔

قول: کچھ اور بننے کی چاہ انسان کو پاگل بنا دیتی ہے۔

قول :جنتی وہ ہے جس کے اندر جنت ہو۔نا کہ وہ جو جنت میں رہنے کا خواب دیکھتا ہو۔

نکتہ :تصور کیا ہے؟ پیر کی موجودگی کو محسوس کرنا ہے۔پیر کا نام اور ظاہری جسم کو پوری طرح سے بھول جانا ہے۔اور جو ذات پیر ہے اس میں اپنی ذات کو اس طرح ڈوبونا ہے جس طرح قطرہ دریا میں گم ہو جاتا ہے۔اسی کا نام فنافی الشیخ ہے۔اور جس دن ذاتِ پیر میں ذاتِ رسول کی موجودگی کا احساس ہوگا،اسی دن فنافی الرسول کا مقام حاصل ہوگا۔اور جس دن ذات پیر میں ذات خدا کا احساس ہوگا۔اسی دن فنافی اللہ کا احساس ہوگا۔اور جس دن ذاتِ خدا اور خودی غائب ہو جائے گی اسی وقت بقاباللہ کا دیدار نصیب ہوگا۔

قول :انسان پانا سب چاہتا ہے اور کھونا کچھ نہیں۔

قول :اس دنیا میں استاد بن کر سیکھنے سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔

علم جنسیات :

تین طرح کی جنسیات یعنی شہوت پائی جاتی ہے۔

(۱)ہائیڈروسیکچول(HYDROSEXUAL):

یعنی اپنے مخالف جنس سے شہوت۔جو عام ہے یعنی مرد اور عورت کے درمیان۔

(۲)ہوموسیکچول(HOMO SEXUAL):

ہم جنس سے شہوت کرنا یعنی مرد اور مرد کے درمیان،عورت اور عورت کے درمیان۔

(۳)اوٹوسیکچول(AUTO SEXUAL):

دونوں کے ملن سے وہ ایک طرح کی اندرونی خوشی محسوس کرتے ہیں اور شاید وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ خوشی دونوں کے ملنے سے ہوئی ہے مگر دونوں کے ملتے ہی ایک دائرہ پورا ہوتا ہے۔ اور وہ دائرہ جسمانی طور پر ہوتا ہے اس سے کوئی اور دنیا میں آسکتا ہے مگر ملن اندرونی خوشی کی وجہ نہیں بن سکتا۔ یہ جسمانی طور پر کچھ آرام محسوس کرا سکتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب دونوں ملتے ہیں تو ایک لمحہ وہ آتا ہے جہاں مرد کے اندر کی عورت اور عورت کے اندر کا مرد دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور ایک باطنی دائرہ پورا ہو جاتا ہے جس کو تصوّف کی زبان میں ہم کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان مکمل ہو جاتا ہے۔ جہاں دوئی کا خاتمہ مختصر وقت کے لئے ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے روحانی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس روحانی احساس کو مستقل بنانے کے لئے مراقبہ میں پوری طرح اترنا ہوگا۔ جو احساس اس کو کسی دوسری عورت سے ظاہری طور پر ہوا اور کسی عورت کو کسی مرد سے ظاہری طور پر ہوا ہوگا۔ مگر جب مرد اپنے اندر کی عورت سے ملتا ہے جس کو آٹو سیکچول (AUTO SEXUAL) کہتے ہیں۔ تو وہ خود پیدا ہوتا ہے۔ جہاں نہ کوئی مرد بنتا ہے نہ کوئی عورت۔ بس ایک نور بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کو نہ مرد نہ عورت بلکہ سراپا نورِ مجسم ہی کہا جا سکتا ہے۔

قول : معدہ شہوت کا دروازہ ہے۔

علم جنسیات: شہوت کے تین تل ہوتے ہیں۔ پہلا تل جسمانی ہوتا ہے۔ جہاں ایک جسم دوسرے جسم سے ملتا ہے اس طرح کی شہوت میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں۔ یہ ملن ادھورا ہوتا ہے اس لئے اس عمل کو بار

بار دوہرانا پڑتا ہے۔ جوان آدمی کی قوت شہوت تیزی سے بنتی ہے اس لئے جوان آدمی میں قوتِ شہوت کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے۔اور جیسے جیسے عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے معدہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے قوتِ شہوت کم ہوتی جاتی ہے۔اس لئے عمر دراز آدمی کم شہوت کرتا ہے۔شہوت کی کمی کی وجہ سے عمر دراز میں ''حوس'' بڑھ جاتی ہے۔ایک نوجوان قوتِ شہوت کے معاملے میں پوری طرح تندرست ہوتا ہے اور عمر دراز قوتِ شہوت کے معاملے میں کمزور ہوتا ہے۔اسی کمزوری کی وجہ سے حوس میں اضافہ ہوجاتا ہے۔جوآدمی آدھا پیٹ کھانا کھاتا ہے اس کا خیال کھانے کے بعد بھی کھانے میں ہی ہوگا۔ جسمانی طور پر بھی شہوت کرنے کے لئے درند، پرند اور دیگر حیوانات بحری و بّری کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے مگر قربان جائیں حضرت انسان پر جس کا کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔نا کھانے کا ناشہوت کا۔اس کے لئے انسان ہمیشہ تیار رہتا ہے۔لقمانِ حکیم سے کسی نے سوال کیا کہ بیوی سے شہوت کب کرنی چاہیے۔ حضرت لقمان حکیم جواب دیتے ہیں کہ زندگی میں صرف ''ایک'' بار۔سائل پھر پوچھتا ہے کہ اگر برداشت نہ ہوتو۔لقمان حکیم جواب دیتے ہیں کہ سال میں ایک مرتبہ۔پھر سوال کرتا ہے کہ پھر بھی برداشت نا ہوتو جواب ملتا ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ پھر وہی سوال کرنے پر جواب ملتا ہے کہ اپنی قبر خود کھود لینا۔ مکڑی کی ایک قسم ایسی بھی ہے کہ ایک مرتبہ کے شہوت کے بعد نر مرجاتا ہے۔ ایسے کئی مخلوق ہیں جو ایک مرتبہ کوئی دو مرتبہ کوئی تین مرتبہ اسی طرح حسب حیثیت مرجاتے ہیں۔کیوں کہ جسم سے نکلنے والی توانائی کے جھٹکے وہ برداشت نہیں کر پاتے اور مرجاتے ہیں۔یہی ان کے لئے قدرت کا نظام ہے مگر

انسان ہمیشہ قدرت کے خلاف ہی چلتا ہے۔ دل کے دورے (HEART ATTACK) کی ایک وجہ کثرتِ شہوت بھی مانی گئی ہے۔ زیادہ شہوت کرنے سے ''قوتِ مدافعات'' یعنی بیماریوں کو دفعہ کرنے والی قوت کمزور ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے بیماریاں جسم میں گھر کر لیتی ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ ''رتن کا جتن کر'' اسی رتن کی بدولت چہرے میں رونق ہوتی ہے آنکھوں میں چمک رہتی ہے۔ زیادہ شہوت سے آنکھوں کی بینائی میں فرق آجاتا ہے۔ گویا آنکھ بھی جسم کا رتن ہے۔ اگر اس رتن کو سلامت رکھنا ہے تو اُس رتن کا جتن کرنا ہوگا۔ چہرے کی کشش کا راز یہی ہے۔

جسمانی تل کی شہوت اوپری سطح کی ہوتی ہے۔ انسان اپنی قوت کا اخراج کرنے کے بعد شاید جسم کو ہلکا اور آرام محسوس کرسکتا ہے۔ اور اچھی طرح سو سکتا ہے۔ جس طرح کوئی نیند کی گولی لے کر سوتا ہے۔ بچوں میں ایک عمر کے بعد قوتِ شہوت بیدار ہوتی ہے اس لئے نظامِ قدرت کے تحت نیچے کی اور ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ قوت بہہ سکے۔ جس طرح لڑکیوں میں ماہ آوری (M.C) اس بات کا سگنل دیتی ہے کہ قوت پوری طرح سے بیدار ہوچکی ہے ٹھیک اسی طرح سے لڑکوں میں احتلام گویا ایک سگنل ہوتا ہے۔ مگر یہ لڑکیوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لڑکا پھر جوان پھر ضعیفی کی عمر کو پہنچتا ہے۔ مگر قوتِ شہوت کا جو بہاؤ نیچے کی اور تھا جو ایک نظام قدرت کی حکمت عملی تھی۔ اس کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ پانی کو اوپر سے نیچے کی طرف آنا آسان ہے ۔مگر یہ حکمت خاص وقت اور خاص مقصد (بقاء نسل) کے لئے ہے۔ انسان کثرتِ شہوت کی وجہ سے اپنی توقیر شہوت کا سُرور اور اپنی مردانگی سے ہاتھ دھو

بیٹھتا ہے۔

دوسرا تل :دوسرا تل قلبی ہے۔بوقتِ شہوت یہاں جسم کے ساتھ ساتھ دل بھی شامل رہتا ہے۔اس طرح سے ہونے والا عمل انسان کو تھوڑی گہرائی تک لے جاسکتا ہے۔اس سے جسم کو آرام اور قلب کو راحت فرحت دلاتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ ایک اور عمل ظہور میں آتا ہے ایک خاص طرح کی کمیاء وقت انزال نکلتی ہے۔جو بچے میں ایک طرح کا خاص وصف پیدا کرتی ہے۔بچہ ذہن فہیم ہوتا ہے۔وہ بچہ جس میدان میں ہوگا وہ کامیاب اور کامران ہوگا۔وہ بچہ جسمانی طور پر بھی تندرست ہوگا کم بیمار ہوگا اور عمر دراز کو پہنچے گا۔اور ذہنی طور پر بھی اس قدر تندرست ہوگا کہ تناؤ کے حالت میں بھی اس کا ذہن کم دباؤ محسوس کرے گا اس کا حافظہ آخری وقت تک اس کا ساتھ دے گا ۔اکثر والدین کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کا بچہ دیگر بچوں سے کم عقل اور نا سمجھ ہے۔اچھے سے اچھے پڑھانے والے اور اچھی اسکول کے باوجود انکا بچہ صفر ہے۔بچے کی اس حالت کے 90فی صد ذمہ داران کے والدین ہوتے ہیں ۔اگر والدین اپنے ہی بچوں کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ کوئی بچہ اپنے دوسرے بھائی سے زیادہ سمجھ دار ہے۔اور کوئی کم کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی مزدور وجہ صاف ہے۔جہاں جسم اور دل ملا وہاں ڈاکٹر۔انجینئر جہاں محض جسم ملا وہاں مزدور جسم اور دل کا ملنا آسان نہیں یہ عمل ایک خاص وقت اور قدرت کاملہ کے تحت ہی ہوتا ہے۔

تیسرا تل :تیسرا تل روحانیت کا ہے۔شاید لوگ سن کر حیران ہو کہ روحانیت اور شہوت کا کیا تعلق، کیونکہ جب بھی ہم نے روحانیت کے خلاف

جس لفظ کا استعمال کیا وہ ہے نفسیانیت۔ شہوت کا یہ یاد رکھو کہ کسی کے ماننے یا نا ماننے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ جہاں لوگوں کا جسمانی سے گہرا قلبی تک پہنچنا مشکل ہو وہاں روحانیت کی بات شاید بے معنی لگتی ہے۔ پہلے روحانی شہوت کو سمجھو۔ یہاں محض ایک جسم سے دوسرا جسم یا محض دل سے دل ملنے کی بات نہیں بلکہ ایک روح کا دوسرے روح میں سما جانا ہے۔ پہلا تل جسم کا ہے جو روزانہ ملتا ہے۔ دوسرا تل دل کا ہے جو کبھی کبھی ملتا ہے۔ تیسرا تل روحانیت کا ہے یہ محض ایک مرتبہ ہی ملتا ہے۔ پھر دوبارہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اس طرح کا واقعہ برسوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں گزرتا ہے۔ اس طرح کے ملن سے ایک روحانی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ زمانہ کروٹ لیتا ہے۔ ایک نئے دور کی شروعات ہوتی ہے۔ اس طرح کے روحانی ملن سے آنے والا بچہ کوئی معمولی نہیں ہوتا بلکہ اپنے وقت کا تاجدار ہوتا ہے۔ ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ روحانی علوم کا بھی امام ہوتا ہے۔ وہ رہبرِ وقت ہوتا ہے۔ ہزاروں چراغ اس سے روشن ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایک ایسی خوشبو لاتا ہے جس کو لوگ ہر دور ہر صدی میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ سارے عالم کو اپنی خوشبو سے مہکا دیتا ہے۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی چمک لاتا ہے۔ جس کے آگے ہزاروں سورج گم ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی چمک سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اور یہی جگمگاہٹ اس کے آنے کی خبر بن جاتی ہے۔ پھر ذرا سوچئے اس طرح کا ملن کیا ایک مرد اور عورت کا ہو سکتا ہے۔ نہیں بلکہ ایک روح کا دوسرے روح سے ملن ہے۔ ایک صدی کا دوسری صدی سے ملن ہے۔ ایک نور کا دوسرے نور سے ملن ہے۔ ایک وجود حقیقی کا دوسرے وجود حقیقی سے ملن ہے۔ کیا اب بھی

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح کا ملن بار بار ہوسکتا ہے، کیا ہر گھڑی ہوسکتا ہے، جی نہیں۔ یہ صدیوں میں ہونے والا عمل ہے۔ کیوں کہ ایک صدی سے دوسری صدی کا ملن ہے۔

نکتۂ عقیدت : عقیدت اور اندھی تقلید کے فرق کو جاننے کے لئے اس کے نتیجے کو دیکھنا ہوگا اس سے ہی فیصلہ ہوگا کہ عقیدت عقیدت ہے یا اندھی تقلید۔ مثلاً آپ کسی آدمی سے عقیدت رکھتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ وہ آدمی غلط ہو اور وہ عقیدت کے قابل بھی نہ ہو۔ اگر ایسے آدمی سے آپ کی عقیدت کا تعلق ہے تو لوگ کہیں گے کہ یہ اندھی تقلید ہے۔ آپ اندھے ہیں، آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ وہ آدمی غلط ہے۔ اگر آپ ایسے کسی قوانین پر عقیدت رکھتے ہیں جس کی کوئی سائنسی دلیل نا ہو تو لوگ کہیں گے کہ یہ اندھی تقلید ہے۔ کوئی قوانین سائنسی ہے یا نہیں یہ اہم نہیں۔ اگر اس قوانین پر عقیدت کی وجہ سے آپ کی زندگی سائنسی ہوتی ہو تو اگر اس عقیدت کی وجہ سے آپ میں تبدیلی آتی ہے اگر وہ عقیدت آپ کو پاک اور باطنی قوت کی طرف لے جاتی ہو تو سمجھنا کہ وہی عقیدت ہے اور وہ قوانین کتنا ہی سائنسی طور پر ہو جس پر عقیدت رکھنے سے زندگی مڑتی ہو نیچے کی طرف آتی ہو تو سمجھنا کہ وہ آندھی تقلید کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ کوئی کیسا ہے ٹھیک ہے یا غلط یہ دیگر بات ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ عقیدت کیسی ہے یہ عقیدت کرنے والے پر منحصر ہے ۔عقیدت کوئی چیز کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ چیز کے تعلق سے ہے۔ کس سے آپ کی عقیدت ہے یہ اہم یا فیصلہ کن نہیں ہے۔

آپ کی عقیدت آپ کے لئے کیا کرتی ہے۔ یہی اہم ہے یہی فیصلہ کُن بات

ہے۔تب ہر آدمی تول سکتا ہے کہ اس کی عقیدت۔عقیدت ہے۔ یا اندھی تقلید۔اگر آپ کی عقیدت آپ کو کہیں نہیں لے جاتی آپ وہیں کے وہیں سڑتے ہیں تو وہ اندھی تقلید ہے۔عقیدت تو ایک آگ ہے جو آپ کو جلا دے گی اور بدل دے گی۔آگ میں ہم سونے کو ڈالیں تو جو کچرا ہے وہ جل جاتا ہے۔سونا بچ جاتا ہے۔آگ سچی ہے یا جھوٹی کیا سونا پوچھ سکتا ہے؟ وہ خود میں دیکھیں کہ جو کچرا تھا وہ جل گیا اور وہ نکھر کر باہر آ گیا تو وہ آگ سچی تھی۔ آگ کو جاننے کا سونے کے پاس اور کوئی ذریعہ بھی تو نہیں۔اگر کچرا سب بچ جائے تو آگ جھوٹی ہے۔آپ اس کی فکر مت کرنا کہ آپ کو کس سے عقیدت ہے آپ اس کی فکر کرنا کہ آپ کے پاس جو عقیدت ہے وہ آگ ہے کہ نہیں۔ وہ آپ کو بدلتی ہے کہ نہیں۔یہ بڑے مزے کی بات ہے کہ آپ جس سے عقیدت رکھتے ہیں وہ کبھی کبھی عقیدت کے قابل بھی نہیں ہوتا۔مگر آپ قابل ہو جاتے ہیں اپنی عقیدت کی وجہ سے۔ایسا روز ہوتا ہے کہ آپ کو جس سے عقیدت ہے وہ پوری طرح سے اس عقیدت کے قابل ہوتا ہے مگر آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔کوئی واقعہ نہیں ہوتا۔آپ نا قابل ہی رہ جاتے ہیں۔مگر ہم سبھی یہ سوچتے ہیں کہ ہماری جس سے عقیدت ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔مگر دوسرے سرے سے دوسری طرف سے دیکھیں کہ صاحب عقیدت ٹھیک ہے یا نہیں۔اگر آپ کی عقیدت آپ کو ڈراتی ہو تو یہ اندھی تقلید ہے۔ آپ کی عقیدت آپ کو لاخوف کرتی ہو تو یہ عقیدت ہے۔آپ کی عقیدت، نفرت، حسد، بغض، لالچ سے بھرتی ہو تو اندھی تقلید ہے۔آپ کی عقیدت، کرم، رحم، بن جاتی ہے تو وہ عقیدت ہے۔اپنے سے تولنے کے علاوہ کوئی

ذریعہ نہیں ہے۔ جو دوسروں سے تولنے چلے گا اسے کوئی قابل ملنے والا نہیں ہے۔ جس سے وہ عقیدت کر سکے۔ جو خود پر سوچنا شروع کرے گا اسے ہر طرف قابل ہی قابل مل جائیں گے جس سے وہ عقیدت کر سکے۔

حکایت :ایک بزرگ تھے۔ان کی یہ صفت تھی کہ وہ ہر کسی پر بھروسہ کرتے تھے اور ہر آدمی آپ کا کوئی نا کوئی سامان لے جاتا تھا۔ بزرگ کے مرید نے کہا: حضرت آپ سب پر جلدی بھروسہ کر لیتے ہیں اور تکلیف اٹھاتے ہیں۔ کم از کم پہلے تحقیق تو کر لینا چاہئے کہ وہ بھروسے کے لائق بھی ہے یا نہیں۔ اتنے آدمی آپ کو دھوکا دے گئے پھر بھی آپ کا آدمیوں سے بھروسہ نہیں چھٹتا۔ وہ بزرگ مسکرا کر کہنے لگے کہ وہ سبھی میرے بھروسے کا امتحان لے رہے ہیں۔ وہ بزرگ اس مرید سے بولے کہ تجھے وہ لوگ زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ سامان تو گیا۔ ساتھ میں تیری عقیدت بھی جا رہی ہے۔ سامان کی کچھ قیمت بھی ہو سکتی ہے۔ اسے دوبارہ بازار سے خریدا بھی جا سکتا ہے۔ مگر عقیدت کی کوئی قیمت نہیں اور نا اسے کسی بازار سے خریدا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ ایسے لوگ ہوں جو مجھے کسی قسم کا نقصان نا پہنچاتے ہوں تو پھر میرے بھروسے کے لئے کوئی کسوٹی بھی نا ہوگی۔ میں آدمی پر بھروسہ کرتے ہی جاؤں گا۔ سوال آدمی کا نہیں بلکہ میرے بھروسے کا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ آدمی پر میرا بھروسہ ہو بلکہ سوال یہ ہے کہ میرا بھروسہ ہو۔ اگر میں آدمی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تو میں کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اس بزرگ کے نظریہ سے دیکھیں تو عقیدت میں زمین و آسمان کا فرق آجائے گا۔ عقیدت اہم ہے کس پر ہے یہ اہم نہیں۔ اندھی تقلید نامرد عقیدت ہے۔ اس سے کچھ

پیدا نہیں ہوتا۔ اسے ہم دماغ کے کسی کونے میں رکھے رہتے ہیں۔ وہ کسی کام کی نہیں اس کا کوئی استعمال نہیں۔ اگر اتنے لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں تو یہ بھروسہ جھوٹا ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر سچ میں اتنے لوگ خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں تو یہ عالم اتنا بدصورت نہیں ہوسکتا جتنا کے ہے۔ اگر اتنے لوگ صحیح میں بھروسہ رکھتے ہیں تو ان کی زندگی میں جو خوشبو آنا چاہیے اس کا تو کہیں پتہ نہیں چلتا۔ صرف بدبو آتی ہے۔ یہ بھروسہ جھوٹا ہے۔ یہ بھروسہ اوپری ہے یہ بھروسہ دکھاوا ہے۔ تو اسے کہتے ہیں اندھی تقلید۔ جو انقلاب لائے آپ کی زندگی میں وہ عقیدت ہے۔ جو آپ کی زندگی کو ٹھہرے ہوئے بدبودار نالے کا پانی بنادے وہ اندھی تقلید ہے۔ جو ملک اندھی تقلید پر ہے وہ بند ڈبّے میں سڑتے رہتے ہیں۔ عقیدت تو ایک بہاؤ ہے ایک تیز رفتار ہے۔ عقیدت مند ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ عقیدت مند ہونے کا مطلب ہے کہ خود کو بدلنے کی تیاری ۔مگر لوگ خود کی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کا مطلب عقیدت سمجھتے ہیں۔ مثلاً کسی ولی کے مزار پر جا کر اپنے ذمہ داری کا ٹوکرا ان کے سر پر ڈال آتے ہیں۔ اور اس عمل کو وہ عقیدت کا نام دیتے ہیں۔ اور اس طرح کی اندھی عقیدت وہ پیر، ولی، خدا دیگر پر کرتے ہیں۔ اور اپنے کو پکا عقیدت مند کی قطار میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے جو خود کو بدلنا چاہتا ہے یا کچھ کرنا چاہتا ہے تو ساری کائنات اس کا ساتھ دینے تیار ہو جاتی ہے۔

نکتہ: قمر علی درویش، پونہ، یا قطب عالم احمد آباد یا دیگر اولیاء کرام کے مزاراتِ پاک کے احاطے میں گول پتھر چپٹا پتھر یا کسی اور بناوٹ کا ہو۔ جس کو چند عقیدت مندانِ اولیاء اپنی انگلیوں پر اٹھاتے ہیں جن کو دونوں

ہاتھوں سے اٹھانا مشکل ہوتا ہے۔ جب ہم ان بزرگ کا نام لیتے ہیں مثلاً ''یا قمر علی درویش'' اس وقت ان کے نام کی روحانیت کی ترنگیں چند سکنڈ کے لیے ایک مخصوص دائرہ بناتی ہے جو اتنے دائرہ کے زمین کی قوتِ جاذبہ (GRAVITY) کو روک دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ پتھر چند سیکنڈ کے لئے ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور پلک جھپکتے اٹھ جاتا ہے۔

نکتہ: سویا ہوا آدمی کہیں نہیں پہنچتا۔ جاگا ہوا آدمی ہی کہیں پہنچ پاتا ہے۔ جاگا ہوا انسان سے مراد وہ آدمی جو جہاں ہوتا ہے وہ وہیں ہوتا ہے۔ اگر کھا رہا ہے تو کھا رہا ہے۔ اگر چل رہا ہے تو چل رہا ہے اور سویا ہوا آدمی کا من کہیں ہوتا ہے اور تن کہیں ہوتا ہے اور وہ خود کہیں ہوتا ہے۔ خواب کے معنیٰ بھی یہی ہوتے ہیں کہ آدمی کا تن کہیں اور من کہیں کسی اور جگہ پر سیر کر رہا ہوتا ہے۔ جاگا ہوا آدمی خواب نہیں دیکھتا بلکہ ہر وقت حقیقت کے روبرو ہوتا ہے۔ جاگا ہوا انسان ہی جی پاتا ہے۔ سویا ہوا انسان گویا مردے کے مانند ہوتا ہے۔ جاگا ہوا انسان اگر سویا بھی ہو تو اس کے اندر ایک ہوش کا دیا جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا میری صرف آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا۔ یعنی میرے دل میں بیداری کا چراغ جلتا رہتا ہے۔

قول: ہر پیدا ہونے والا بچہ اپنے ساتھ ایک سوال لے کر پیدا ہوتا ہے۔

اوم کیا ھے

جس طرح اہل اسلام کسی کام کے آغاز میں بسم اللہ، پڑھتے یا لکھتے ہیں اسی طرح اہل ہنود چاہے کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو کسی کام کی ابتداء میں اوم کہتے اور لکھتے ہیں۔ اس کے بغیر کسی بھی کام کے آغاز کو وہ بُرا (اشوب) مانتے ہیں۔ یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ ہندو مذہب کے پنڈت کے قول کے مطابق لفظ، اوم، خدا کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کو ایشور۔ بھگوان وغیرہ کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کچھ ہندو مذہب کے پنڈت اس معنیٰ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ چنانچہ پنڈت گوری دت نے اوم کے تذکرہ میں تحریر کیا ہے ''پربھو یا پرماتما کے کارن اوم کو نہیں تابرتا جاتا ہم اس کو ایک پوتر (پاک) نام جان کر لکھتے ہیں اور بولتے ہیں تا کہ ہمارے کام سدھ ہو جائیں۔ (از) رسالہ بھکتی لاہور بابت جدائی (۱۹۲۲ء) مضمون بعنوان ''رام ودیا''

پنڈت ہردیال ایم۔اے ساشتری سنسکرت، انگلش ڈکشنری میں اوم کے معنی یوں لکھتے ہیں۔

OM,A holy word of Sanskrit language which is showing different meanings,but true meanings are following:

1] A hand of God, 2] A power of God & A strength of Nature,{the Sanskrit English dichonary by Pt.Har Dayal M.A.Shastri,Published by Mahatma Book Hall Bazar, Amritsar,Printed in General Electric Press Amritsar 1907.}

ترجمہ: ''اوم'' یہ سنسکرت زبان کا ایک پاکیزہ لفظ ہے جو مختلف معانی کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس کے حقیقی اور اصل معنی حسب ذیل ہیں۔

(۱) خدا کا ہاتھ (۲) خدا کی قوت (۳) فطرت کی طاقت لیکن۔ ڈاکٹر ۔کے۔سی چکرورتی کی نعت میں اوم کے معنی یوں مرقوم ہیں۔ (ملاحظہ ہو سنسکرت انگلس ڈکشنری۔ مصنف پنڈت ہردیال ایم۔اے شاستری شائع کردہ مہاتما بک اسٹال۔ ہال بازار امرتسر مطبوعہ جنرل الیکٹرک پریس امرتسر 1907)

مسٹر کے سی۔ چکرورتی ایم۔اے نے اوم کے معنی یہ لکھے ہیں:

OM: A Powerful hand of God . A Powerful light of God .(A moedern dictionary of Sanskrit and English,edited by k-c.chakrawarti M.A.Publisher,Narain Pustakalay,Delhi,Printed at t he Eastern Public Press, Delhi.[India 1918].

ترجمہ: ''اوم'' خدا کا ایک طاقت ور ہاتھ، خدا کی ایک طاقت روشنی (ملاحظہ ہو سنسکرت انگلش ڈکشنری مؤلفہ کے۔سی۔ چکرورتی ایم۔اے شائع کردہ نارائن پستکالیہ دلی۔ مطبوعہ ایسٹرن پبلک پریس دہلی۔ بھارت 1918ء)

مسٹر جگت لال فاضل سنسکرت نے اوم کے معنی یہ لکھے ہیں:

OM: The strenghened hand of nature coaching the world,the father of earth, the face of good.

ترجمہ: ''اوم'' (۱) قدرت کا وہ قوت یافتہ ہاتھ، جو نظام عالم کو چلاتا ہے ۔(۲) زمین کا باپ (۳) خدا کا چہرہ سنسکرت اور ہندی کے پنڈت وشوانا تھ نے اپنی کتاب میں ''اوم'' کے معنی یہ لکھے ہیں۔

ॐ प्रमात्मा की शक्ति जो धरती आकाष और मानुष्यों के काम चलाती है।

ترجمہ: اوم پرماتما کی ایک قوت جو زمین و آسمان اور سب انسانوں کے کام چلاتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام معنی مطالب کی روشنی میں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خدا کا ہاتھ خدا کی قوت قدرت کی طاقت خدا کا طاقتور ہاتھ وہ کون عظیم الشان ہستی ہے۔ جس کی فضیلت میں اوم کا لفظ وارد ہوا ہے۔

براہتھ رشی کی پیشن گوئی قبل مسیح ۵۵۰۰

ق۔م ۵۵۰۰ بہت پرانے زمانے کی بات ہے ولادت مسیح سے پانچ ہزار پانچ سو سنہ برس پہلے کی بات ہے۔ ہندستان میں ایک رشی (درویش) جنگلوں اور پہاڑوں کی خوب سیاحت فرمایا کرتے تھے۔ نام نامی براہتھ اور لقب ''کلاشن'' تھا۔ ان کو چاروں ویدوں اور چھئیوں شاشتروں پر نہ صرف عبور حاصل تھا بلکہ وہ عالم باعمل تھے۔ بیابانوں اور کوہساروں میں آسن جما کر یوگ اور گیان دھیان میں مصروف رہتے اور کبھی کبھی آبادیوں میں جا کر بھی دھرم کا پرچار کرتے تھے۔

ہمالیہ کے دامن میں ان دنوں ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ جو ''نربیام'' کے نام سے مشہور تھا۔ ایک روز براہتھ رشی اس قصبہ میں چلے گئے انھیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہاں کے لوگ خدا شناسی اور نیکی بدی کی تمیز سے دور ہیں اور انسانیت کا جوہر ان میں مفقود ہے۔ رشی جی دو چار دن تو اپنی تپسیا اور پرارتھنا

میں لگے رہے۔اور لوگ ان کے عجیب وغریب اعمال کو دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔آخر ایک دن انھوں نے ان لوگوں کی دعوت کی جب قصبہ کے تمام آدمی جمع ہو گئے تو انھوں نے اعلیٰ قسم کے پھول اور دوسری نفیس ترین چیزوں سے ان کی تواضع کی۔ان لوگوں نے ایسی چیزیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔اس لئے رشی جی کو وہ اور بھی حیرت سے دیکھنے لگے اور کہنے لگے یہ کوئی بڑی ہی پوتر اور پوجیہ پادہستی ہے۔اب رشی براہتھ جو کچھ بھی ان سے کہتے، وہ لوگ ان کے حکم کی تعمیل کرتے اور ان کی باتوں پر خوب کان دھرتے تھے۔

ایک دن رشی جی نے پھر سب کو جمع کیا اور قسم قسم کی لذیذ چیزیں کھلانے کے بعد کہا۔

اے میرے سجنّوں! یہ باتیں انسان میں تب ہی پیدا ہوسکتی ہیں کہ وہ اپنے خالق اپنے مالک۔اپنے پالنے والے کو مانے اور اس کے حکموں پر چلے اور اس کی مرضی کے کام کرے۔اس کی عبادت بجالائے اور اس کو خوش رکھے ۔دیکھو میرے مترو! یہ تم کو آکاش اور دھرتی میں جو کچھ نظر آتا ہے۔یہ سب ایشور بھگوان کی مہما ہے۔اس کی قدرت ہے اس کی تجلیاں ہیں۔وہ خود تو دکھائی نہیں دیتا۔پر اس کے جلوے ہر وہ انسان دیکھ سکتا ہے جو اس سے پریم کرتا ہے جو اس کی پریت کی آگ دل میں روشن کرتا ہے۔پرمیشور ہی جی کی چاہنا یہی ہے کہ اس کی پوجا پاٹھ میں ہر وقت انسان لگا رہے۔

جو انسان اس کی مرضی پر چلتے ہیں۔اور پاپوں، اپرادھوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیتے وہ نہ صرف دنیا میں سکھ پاتے ہیں بلکہ پرلوک میں بھی سورگ کی بہاریں لوٹتے ہیں۔

براہتھ رشی کے اس گیان بھرے اپدیش کو سب لوگ بڑی توجہ۔ مدھ اور پریم سے سن رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب پر ایک مستی سی چھا گئی ہے ۔پھر براہتھ رشی نے لوگوں کو آواز دی۔

اے میرے سجّنوں! ایک بات تمھیں بتا دوں جو بڑی اہم بھی ہے اور حیرت انگیز بھی! اور وہ یہ ہے کہ جب تک اس کے پیاروں سے محبت نہ لگائی جائے گی۔ جب تک ایشور پرماتما کے پریمیوں سے پریت نہ کی جائے گی اور ان کا کہنا نہ مانا جائے گا۔ ان کی فرمانبرداری نہ کی جائے گی۔ اور ان کی شان اور فضیلت اور ان کے درجات کی پہچان نہ رکھی جائے گی۔ تب تک کو تپسیا اور کوئی پرارتھنا اور کوئی یوگ کسی کام کا نہیں۔ ان کی محبت اور اطاعت کے بغیر انسان کے کرم اور سارے تپ (اعمال وعبادت) اکارت جائیں گے۔

سامعین میں سے کسی نے پوچھا۔ رشی مہاراج! وہ پرتما کے پیارے کون ہیں؟ کیا وہ مہرشی اور منی اور یوگی، جو گزر چکے ہیں؟

براہتھ نے کہا: ''ہاں وہ بھی ہیں جو گزر چکے ہیں۔ اور اپنی تعلیمات و فرمودات کو سنسار میں پھیلا چکے ہیں۔ ان سب کی فرمانبرداری کرنا۔ اور ان سے پریم رکھنا بھی فرض ہے۔ مگر ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہیں ان کا علم تم کو نہیں ہے۔ تمھیں کیا؟ بعض بڑے بڑوں کو ان کی خبر نہیں ہے۔ عام لوگ ان پاک ہستیوں کو نہیں جانتے۔ لو سنو!

''ایک بہت دور سمے میں جبکہ سنسار کا آخر ہونے والا ہوگا۔ اور وہ آخری زمانہ کہلائے گا۔ تو اس زمانے میں ایک بہت بڑا مہاتما اور مہاراجاؤں کا مہاراج پیدا ہونے والا ہے جو ہر پرکار کا اپنا چمتکار (معجزہ) دکھائے گا۔ اس

کے جنم پر آگ ٹھنڈی (فارس کے آتش کدہ کی طرف اشارہ ہے) ہو جائے گی ۔بت اوندھے منھ گریں گے۔درخت اور پتھر اور حیوان اس کو ماتھے ٹیکیں گے ۔اور ہر چیز اس کو نمسکار (درود وسلام) کرے گی۔اس بڑے مہاراج کا پوتر نام (پاک نام) ''مہامتّا'' (حضرت محمدؐ) ہوگا۔جس کی انگلی سے چندر ما کو دو ٹکڑے (شق القمر) کرے گی۔اور وہ ایشور کا ہاتھ کہلائے گا۔یعنی (یدُ اللہ) وہ پرماتما کا مکھڑا (وجہ اللہ) ہوگا وہ بھگوان جی کی وہ سوریہ (سورج) پلٹا دے گا ۔جس طرح پرمیشور کے بہت سے نام ہیں اسی طرح ان کا بھی ایک نام 'اوم' ہوگا۔(رسالہ سرسوتی دہلی بابت) ماہ مارچ 1967ء بحوالہ کتاب سورن شاکھا ۔نیز۔ترلوک پوتھی'' مؤلفہ پنڈت ترلوک چند۔شائع کردہ آریہ بک ڈپو آگرہ مطبوعہ آریہ سسٹم پریس آگرہ 1939ء)

حاصل مطلب پیشن گوئی

اس پیشنگوئی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما رشی براہتھ نے اوم کی تشریح میں کسی بہت بڑی ہستی کی آمد کی خبر دی ہے۔ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتابوں میں حضور اکرم ﷺ کو راجاؤں کا مہاراجا بڑا مہاراج جس کو اہل اسلام سید الانبیاء شہنشاہ رسالت کہتے ہیں۔اور حضورؐ کا اسم مبارک ''مہامّت'' ''مہامتّا'' وغیرہ لکھا ہے۔اس پیشنگوئی میں کوئی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی ۔کیونکہ براہتھ رشی نے حضورؐ کے مخصوص فضائل بیان کئے۔مثلاً حضورؐ کے ظہور مبارک پر ایران کے آتش کدے کا ٹھنڈا ہو جانا۔کعبے کے بتوں کا منھ کے بل گرنا اور ٹوٹنا۔وحجر وشجر اور حیوانات کا حضورؐ کو سجدہ کرنا اور حضورؐ کے اشارۂ انگشت سے چاند کا شق ہونا وغیرہ پیش کیا ہے۔اسی پیشنگوئی میں رشی براہتھ

نے آپؐ کے اوصاف لکھے ہیں جو اوم کے معنی کے مشابہ ہیں۔ جیسے

(۱) ایشور کا ہاتھ یعنی خدا کا ہاتھ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِھِمْ اس لحاظ سے حضورؐ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔

(۲) ایشور کا مکھڑا خدا کا چہرہ حدیث پاک میں حضورؐ فرماتے ہیں مَنْ رَانِیْ فَقَدْ رَاءُ الْحَقُ (جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا) اس لحاظ سے حضورؐ کا چہرۂ مبارک وَجْہُ اللّٰہ ہے۔

(۳) بھگوان کی شکتی خدا کی طاقت شق القمر کے معجزہ سے یہ بات واضع ہو جاتی ہے کہ حضورؐ خدا کی طاقت قوت اللہ ہیں۔

(۴) ڈوبے ہوئے سورج کو پلٹانے والا کون ہے؟ تاریخ اسلام کے اوراق اس معجزہ کے گواہ ہیں کہ حضورؐ نے ڈوبا ہوا سورج پلٹایا۔

کلنکی پوران سے ایک اور ثبوت:

ہندوؤں کی مشہور کتاب کلنکی پوران میں ہے کہ کلنکی اوتار برہمن کے گھر میں پیدا ہوں گے۔ ان کا مقام پیدائش شمبل ان کے باپ کا نام وشنوداس ان کی ماں کا نام سومتی ہوگا۔

(از کلنکی پوران مطبوعہ صادق المطابع میرٹھ صفحہ ۵، ۶، ۷)

پوران میں لکھا ہے کہ کلنکی اوتار برہمن کے گھر جنم لیں گے۔ جس طرح مسلمانوں میں سیّدوں کا مقام ہے اسی طرح ہندوؤں میں برہمن کا مقام ہے۔ اس لحاظ سے حضورؐ سیّد کے گھر تولد ہوں گے۔ اس کے دوسرے معنی مندر میں جو پوجا پاٹھ کرتے ہیں اسے بھی برہمن کا درجہ دیا جاتا ہے اس لحاظ سے حضورؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب کعبہ کے متولی تھے۔ 'شمبل' عرب کو کہتے ہیں۔

وشنوداس جس کے معنی خدا کا بندہ اس کو عربی میں عبداللہ کہتے ہیں ۔ یہ کلنکی اوتار کے والد کا نام ہے۔ سومتی جس کے معنی امانت دار جس کو عربی میں آمنہ کہتے ہیں۔ جو کلنکی اوتار کی ماں ہے۔

اب ہندوؤں کی اس مستند کتاب سے بات پوری طرح سے واضع ہو جاتی ہے کہ رشی براہتھ کی پیشن گوئی اور پوران کی پیشن گوئی حضورؐ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

لفظ اوم کی شکل لفظ علی سے کافی ملتی جلتی ہے۔

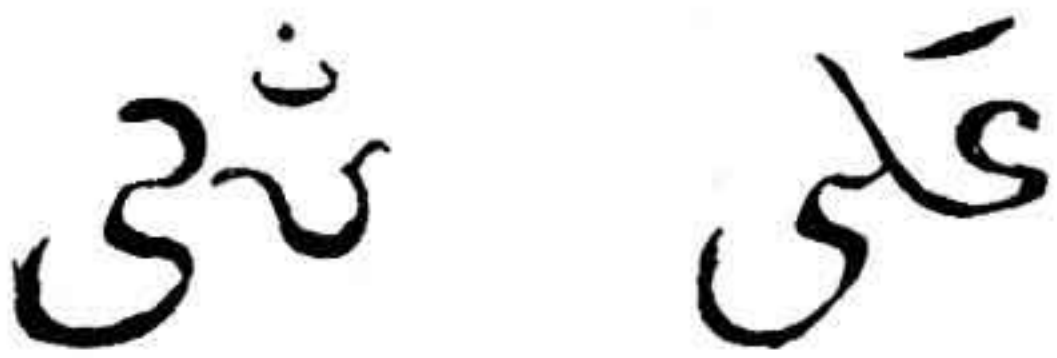

اوم کے کئی معنوں میں حضرت علی سے ہم معنی ہوتے ہیں ۔ مثلاً مٹی کا باپ = ابوتراب اللہ کا چہرہ = کرم اللہ وجہ خدا کی طاقت = قوت اللہ سیف اللہ جس طرح اللہ کا نام بھی علی اور اس کے ولی کا نام بھی علی ۔ اسی طرح سنسکرت اور عربی (خصوصاً عربی کوفی) میں اس کا اسم مبارک ''علی'' قریباً ایک ہی جیسے رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ حالانکہ کہاں سنسکرت اور کہاں عربی۔ مگر اللہ پاک کو اپنے ولیٔ پاک کا معجزہ دکھانا تھا کہ اس نے اوم کے سنسکرت لفظ اور۔ علی کے عربی لفظ کی صورت وشکل میں ایک گونہ مشابہت اور مماثلت پیدا کردی چنانچہ سنسکرت میں ''اوم'' کو..... کی شکل میں لکھتے ہیں اور عربی کوفی رسم الخط میں علی کو علی کی صورت میں لکھا جاتا ہے ۔ آپ دونوں الفاظ ''اوم'' سنسکرت ۔ اور لفظ ''علی'' عربی کوفی کی شکل وصورت کو بغور دیکھئے۔ ''اوم'' کو

علی اور اور ''علی'' کو اوم پڑھا جا سکے گا۔ یوں بھی دونوں زبانوں کے الفاظ کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجئے۔ (علی) فرمائیے کیا بنا؟ علی یا اور کچھ؟ علاوہ بریں۔ اگر حجازی، نجدی، تہامی، مصری، رسم الخطوں کو ہی لیا جائے تو بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ (وہ بھی صرف ایک دندانے کا فرق) اور علی کے الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً سنسکرت کا اوم علی اور عربی کا علی بتائیے کوئی خاص فرق ہے؟ کچھ بھی نہیں!

بعض ہندو حضرات جو 'اوم' کو ہندی میں ..... لکھتے ہیں۔ یہ سنسکرت کا مستند اور قدیم رسم الخط نہیں بلکہ بھاشا رسم الخط ہے۔ صحیح سنسکرت رسم الخط میں 'اوم' کی شکل وہی ہے جو اوپر درج ذیل ہے۔

اسی طرح کاٹھیا واڑی کی گجراتی، مرہٹی زبان، بنگالی زبان، آسامی زبان اور برہمنی زبان میں بھی بالکل معمولی اختلاف کے ساتھ ''اوم'' کو اسی طرح لکھتے ہیں جس طرح سنسکرت میں لکھا جاتا ہے۔

خوشخبری

عرفانی کلاموں کا مجموعہ

پیمانۂ معروف

بہت ہی جلد منظر عام پر آ رہی ہے۔

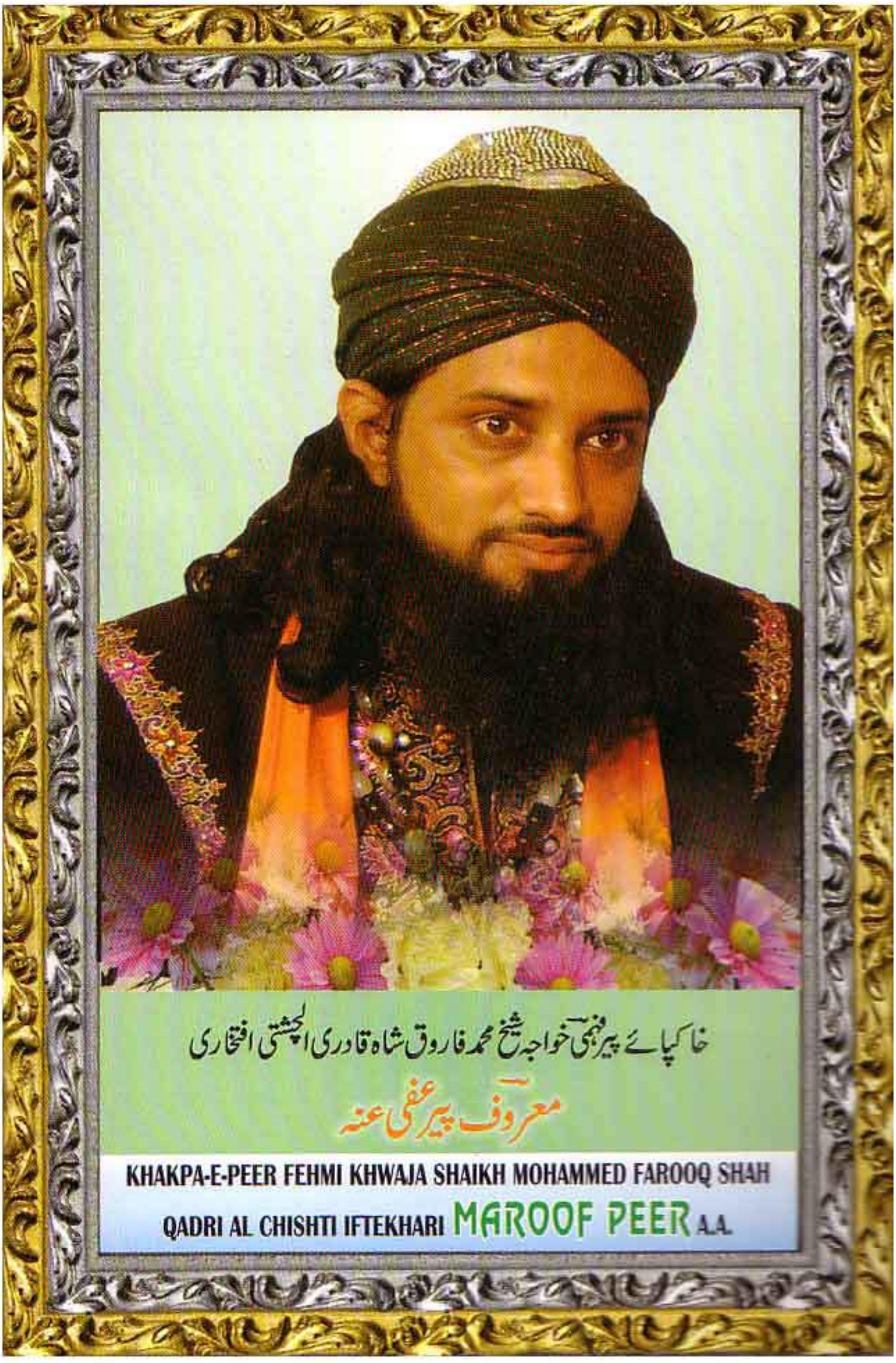

خاکپائے پیر فہمی خواجہ شیخ محمد فاروق شاہ قادری الچشتی افتخاری

معروف پیر عفی عنہ

KHAKPA-E-PEER FEHMI KHWAJA SHAIKH MOHAMMED FAROOQ SHAH

QADRI AL CHISHTI IFTEKHARI MAROOF PEER A.A.

اہلِ سلسلہ حضرت پیر فہمی مدظلہ العالی کے خدمات

نورالایمان (ہندی)

آئینۂ معروف (ہندی)

پیر کامل (ہندی)

تخلیق آدم (ہندی)

انسانی پیدائش (ہندی)

نورالایمان (اُردو)

آئینۂ معروف (اُردو)

پیر کامل (اُردو)

آدم تخلیق (اُردو)

انسانی پیدائش (اُردو)

اسرار وجدانی (ہندی)

لو اُجالے لوٹ آئے (اُردو)

لو اُجالے لوٹ آئے (ہندی)

پیمانۂ معروف (اُردو)

پیمانۂ معروف (ہندی)

شش جہت کا طغرہ

کلمۂ طیب کا طغرہ

بیانِ معروف مختلف عنوانات پر عرفانی بیانات کی ویڈیو-سی-ڈی-(V.C.D.) دستیاب ہیں۔

خاکپائے پیر فہمی خواجہ شیخ محمد فاروق شاہ قادری الچشتی افتخاری معروف پیر عفی عنہ

پتہ : بھگت سنگھ نگر نمبر ۱، مسجد طیبہ کے مقابل، لنک روڈ، گوریگاؤں (ویسٹ) ممبئی-۱۰۴

Mobiles : 9869 158 482 / 9324 832 490 Phone : 022 - 3243 9857.

E-mail : maroofpeer@yahoo.com E-mail : peermaroof@yahoo.com

DESIGNING & PRINTING BY DECENT CREATIONS : 977 3039 800/ 9867 914 724 / 022 - 641 80 700.